سعدیہ عزیز آفریدی
دل کے رنگوں میں
حُسن زندگی کا
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ناولٹ

اس وقت وہ کالج سے نکلی ہی تھی کہ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے ہی رہ گئی۔ اس نے اچٹتی سی نظر دوبارہ سامنے ڈالی اور ثابت ہو گیا کہ وہ خواب تھا نہ خیال بلکہ واقعی ایک جیتا جاگتا وجود لیے اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس کا صبح کا خیال "ہو گا کوئی بے چارہ" غلط ثابت کر رہا تھا۔ ورنہ گھر سے اپنے ساتھ ساتھ سفر کرتے اس شخص کو دیکھ کر اس کا یہی گمان تھا کہ ہو سکتا ہے اس کا روٹ بھی یہی ہو۔ دراصل بات یہ تھی وہ ہمیشہ منفی پہلو سے مثبت پہلو نکال ہی لیا کرتی اور ساتھ ہی ساتھ اسے گمان تھا جس طرح وہ دنیا کو سادگی اور سچائی سے دیکھتی ہے دنیا میں اور بسنے والے بھی اسی طرح سوچتے اور سمجھتے ہوں گے۔ دنیا اس کے لیے کتابوں کی خوب صورتی اور خیالوں کے بنت کیے محلوں جیسی اصلی اور حسین و مصفا ہوا کرتی تھی اور شاید اس کا یہی سبب تھا کہ آج تک اس نے جہاں سانسیں لی تھیں وہاں ایسے ہی خیالوں کا ڈیرا رہا کرتا تھا۔ پیار محبت سے گوندھی گئی اماں تھیں۔ پر شفقت ماموں جان تھے۔ ممانی جان تھیں تو تنک چڑھی مگر پھر بھی تکلیف کے وقت وہ بھی برکھا سایہ بن جاتی تھیں۔ تین کزنز تھیں اور اس کی اپنی پانچ بہنیں، سب مل جل کر یوں رہتے کہ بس وہ ٹکڑا اسے زندگی محسوس ہوا کرتا۔ زندگی جو مہکار تھی، چہکار تھی مگر یکدم ہی چہکاریں دم توڑنے لگی تھیں اور دل میں عجیب طرح کا ہراس اور خوف پھن کاڑھے بیٹھ گیا تھا۔

"آخر یہ شخص ہے کون اور میرے تعاقب میں اسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟۔" اس نے شوز زمین پر ہولے ہولے بجا کر کئی بار سوچا پھر ڈرتے سہمتے سڑک پر اپنی بس کا انتظار کرنے لگی۔ چار قدم دور وہ شخص ابھی تک اس کی طرف متوجہ تھا۔ بظاہر اس کی نگاہیں سامنے تھیں لیکن عائنہ حاکم کی حسیات برملا اظہار کر رہی تھیں کہ وہ مکمل اس کی طرف ہی مرکوز ہے۔ شکر خدا کا یہی تھا کہ اس نے ابھی تک بدتہذیبی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا ورنہ اکیلے وہ اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتی تھی۔ لڑکیاں اور بھی کھڑی تھیں مگر اس کی توجہ کسی اور طرف نہیں تھی اور عائنہ حاکم اس لیے ہی خود کو غیر محفوظ محسوس کرنے میں حق بجانب تھی۔ لیکن اس وقت کچھ بھی نہ کیا جا سکتا تھا سو وہ تن بہ تقدیر کھڑی ہی رہی یہاں تک کہ اس کی مطلوبہ بس اس کے سامنے آرکی۔ وہ بھی دوسری لڑکیوں کے ساتھ بس میں سوار ہو گئی۔

سیٹ پر بیٹھی ہی تھی کہ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ شخص سامنے ہی کھڑا تھا۔ دریدہ اس کی تمام توجہ بھری ہوئی بس میں خود کو بیلنس رکھ کر کھڑے ہونے میں صرف ہو رہی تھی مگر عائنہ حاکم کو اب بھی پہلے والا احساس حاوی لگ رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ دعا کر رہی

تھی کہ جلد سے جلد گھر آجائے حقیقتاً" یہ بچکانہ سی دعا تھی اس لیے مطلوبہ وقت پر ہی اس کا گھر آیا۔ بس روک کروہ اسٹاپ پر اتری' سڑک کراس کرتے ہی دوسری سمت میں اس کا چھوٹا بنگلہ تھا مگر پاؤں ایسے من من بھر کے ہوگئے تھے کہ یہ فاصلہ صدیوں لمبا لگنے لگا تھا۔ وہ تیز تیز سانسوں کے ساتھ سڑک کراس کرکے دوسری طرف پہنچی تو بے ساختہ اس نے مڑ کے دیکھا' وہ شخص اس سڑک پر کھڑا ہولے سے مسکرائے جارہا تھا جیسے اب تک کی ساری کارروائی محض لطف اندوزی کی سادہ سی کوشش تھی۔

"جانے کیا سمجھتا ہے خود کو' میں کوئی ڈرتی ہوں اس سے۔" اس نے گھور کے دیکھا پھر زمانے بھر کی تلخی سمیٹ کر ہنکارا بھر کر گردن موڑلی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو ہیجانی کیفیت میں مبتلا۔ اعصاب کو ایسا ہی لگا جیسے وہ یکدم تپتی دھوپ سے گھنے سائے میں آگئی ہو' یہ گھر کس قدر مختصر اور سادہ سا لفظ ہے مگر اس عام اور سادہ لفظ میں کتنی آسودگی' کتنا تحفظ ہے۔

اس نے چادر سر سے اتارتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھائے مگر ڈرائنگ روم میں اماں کی تیز تیز آواز میں بولنے کی آواز سن کر وہ متحیر رہ گئی۔ یہ طرزِ تخاطب اماں کا کبھی نہیں رہا تھا۔

وہ تو ہمیشہ اتنا ہلکا اور آہستہ بولتی تھیں کہ ایک بات کے لیے اسے کئی بار ٹھوکا دینا پڑتا اور ماموں جان کہتے۔

"بڑی سعید روح ہے میری بہن کی' یہی تو بولنے کا اصل لہجہ ہے' مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتیں وہ خواتین جو چلا چلا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ نرمی میں جو تاثیر ہے وہ سختی میں کہاں' جیسے بولنے سے زیادہ اثر خاموشی میں ہوتا ہے۔"

اور وہ ہنس پڑتی "سچ کہتے ہیں ماموں! اماں واقعی نایاب لوگوں میں شمار کرنے کے قابل ہیں۔ آئندہ صدی میں یہ نادر و شاہکار وجود دوبارہ دنیا میں بھیجنے جانے کا کوئی امکان نہیں۔"

اماں گھور کے دیکھتیں تو وہ ہنس کر ان کے گلے میں جھول جاتی پھر یقین دلانے والے لہجے میں کہتی۔

"اماں! آئی سویئر' آپ اپنے وجود میں ایک نادر اور ماسٹر پیس ہیں۔ کاتب قدرت نے آپ کو تخلیق کرکے تخیل کا قلم توڑ دیا ہوگا۔"

"چل ہٹ' مت بنایا کر۔"

"میں کیا بناؤں گی۔ آپ کو تو اللہ نے خود اتنی فرصت سے بنایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔"

اور اماں کے ہنکھڑی سے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہلکورے لینے لگتی' اور وہ ہاتھوں کا پیالہ بنائے ٹکٹکی باندھے انہیں تکے جاتی۔ میدے کی طرح شفاف رنگ' بڑی بڑی آنکھیں' لمبی پلکیں' ستواں ناک' سڈول جسم' لمبے کالے بال جن میں وقت نے کہیں کہیں چاندی بکھرائی تھی مگر لگتا تھا یہ ان کی ریاضت کا صلہ تھا کہ بادشاہ وقت نے ان کے ماہ و سال کو چاندی کی افشاں سے روپہلا کردیا تھا مگر اس وقت حیرت انگیز طور پر وہی اماں گھن گرج کے ساتھ تیز اور اونچا بول رہی تھیں' سو وہ حیرت سمیٹے ڈرائنگ روم کے دروازے پر آرکی۔

ایک شخص سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اور عائنہ حاکم کو پتا نہیں یوں کیوں لگا جیسے وہ اس چہرے کو جانتی تھی۔ بہت قریب سے' بہت حساسیت سے۔

"پلیز عاصمہ! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"نہیں۔ اب ایک لمحہ بھی نہیں ہے آپ کے لیے۔ جب آپ کو ہماری پروا نہیں تھی تو اب کیا یہ ضروری ہے ہم آپ کی ایک ہی پکار پر اٹھ کر چل پڑیں۔"

"صرف ایک پکار پہ عاصمہ! دو مہینے ہوگئے ہیں مجھے تمہارے در سے نامراد لوٹتے ہوئے۔"

"اور مجھے اسی بات پر حیرت ہے' یہ سب تو آپ کے مزاج کے بہت خلاف ہے۔ آپ تو ایک بات سے دوسری بات بھی نہیں سنتے تھے۔"

"ہاں وہ بھی میرے مزاج کا ایک پہلو تھا اور یہ بھی میرے ہی مزاج کا رخ ہے کہ میں چاہتا ہوں میں تمہیں اور اپنی بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"بیٹیوں کو حالانکہ آپ نے ان ہی بیٹیوں کی وجہ سے مجھ پر زندگی تنگ کردی تھی۔ آپ کو تو ان معصوم وجودوں سے نفرت تھی ناں پھر کیونکر یہ نفرت محبت میں بدل گئی؟"

"صرف اس لیے کہ مجھے اب تم سب کی ضرورت ہے۔"

"محض ضرورت؟ یعنی اب بھی آپ کو محبت نہیں کھینچ لائی صرف ضرورت ہی کھینچ کر لائی ہے۔ حاکم سرور! آپ۔۔۔ شاید کبھی نہیں بدل سکتے۔"

"ہاں شاید! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے مگر پلیز' ایک موقع تو دو' کیا پتہ میں بدل ہی جاؤں اب جبکہ میرے پاس نہ ماہ و سال کی نقدی ہے نہ بلند آہنگ غرور رہا ہے۔ سب میری طرح تھک گئے ہیں عاصمہ! مجھے سہارے کی ضرورت ہے۔"

اماں نے غور سے انہیں دیکھا اور بے قراری سے پوچھا۔

"کیا کیا ہوگیا ہے آپ کو؟"

اور بابا سائیں سہارا ملتے ہی ڈھے گئے۔ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح رونے لگے۔ اماں قریب چلی آئیں اور عائنہ حاکم وہیں پردہ تھامے کھڑی رہی۔ کمرے میں بابا سائیں کی آواز ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ اپنے وجود کی دفاع کی آخری جنگ کی داستان سنا رہے تھے۔ جس میں میڈیکل نے ثابت کیا تھا کہ وہ مرنے والے ہیں۔ وہی دل جس نے ہزاروں چہروں کو اس میں بسایا' اپنوں کو در بدر کرکے' آج وہی با اختیار دل بے اختیار ہوچکا تھا۔ وہ جو ہمیشہ خود فیصلہ کیا کرتے تھے۔ بنا کسی پس و پیش کسی خوف کے آج ان کے فیصلے کہیں اور ہو رہے تھے اور انہوں نے اپنی مسند اختیار و اقتدار سے اپنی بے دخلی کو محسوس کرکے جان لیا تھا کہ وہ اب تک دھوکے میں رہے تھے اقتدار اور اختیار تو ہمیشہ اسی رب کے پاس رہا ہے جس سے وہ سدا روگردان رہے یا اگر یاد کیا بھی اسے تو ایسے ایک عام روزمرہ کا کوئی کام' رب کو رب کی طرح انہوں نے کبھی مانا ہی نہیں تھا مگر اب ہر جگہ وہی مان اور وہی حاکم دکھائی دے رہا تھا۔ اور بابا سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ایک نئے فیصلے کے منتظر اماں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں جیسے چاندی کے شفاف کٹوروں میں پہلی بارش کا پہلا پانی' وہ ضبط سے اماں کو دیکھتی رہی پھر بلک اٹھی۔

"اماں!" اماں نے چونک کر پشت کی طرف دیکھا۔

"عائنہ!" سر جھکائے بابا سائیں نے بھی چونک کر دیکھا۔ تین برس کی عائنہ حاکم' ان کی پہلی اولاد کس قدر بڑی ہوگئی تھی۔ دو لمبی چوٹیاں گوندھے سفید یونیفارم میں وہ اپنی ماں کی طرح ہی پاکیزہ روح لگ رہی تھی پاکیزہ روح یا شاید نیکی کی پری جس کا کام دلوں کا دکھ چننا اور غم بانٹنا تھا ازل سے اور ابد تک کے لیے۔

"بابا سائیں۔" وہ بے ساختہ اندر بڑھ آئی تو بابا سائیں بے وقت اٹھے اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور عائنہ حاکم نے پہلی بار اپنے باپ کے دل کی دھڑکن اتنے قریب اور اتنے غور سے سنی اور سوچا۔

"اتنے متوازن انداز میں دھڑکنے والا دل یکدم بھلا کیسے تھم سکتا ہے۔ ڈاکٹر تو یونہی اپنی قابلیت جھاڑتے ہیں ورنہ چھ بیٹیوں کے ہوتے' ان کی محبتوں اور دعاؤں کے ہوتے بھلا موت اس کے باپ کو کیسے اچک سکتی ہے۔ وہ سب اپنے باپ کے لیے حصار بن جائیں گی۔" اور وقت اس کی اس معصوم سوچ پر ہنس دیا' اور وہ بے خبر بابا سائیں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے انہیں تسلیاں' دلاسے دیتی رہی۔ زندگی کا فلسفہ محبت کی زبان میں سنائے گئی۔

اس وقت اس کے ذہن سے صبح والا واقعہ بھی بھول چکا تھا۔ وہ مکمل طور پر اپنے پیارے سے بابا سائیں کی طرف متوجہ تھی جنہیں وقت نے بے طرح تھکا دیا تھا اور بابا سائیں اس کا سر اپنے زانو پر رکھے اب تک کی دوری کا سبب بتا رہے تھے۔ رنجیدہ و شرمندہ سے کہ ایک وارث کے لیے انہوں نے کیسے کیسے نہیں عاصمہ حاکم کا دل توڑا۔ آج انہوں نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ سب حقیقت گوش گزار کردی تھی اور اس نے بابا کے سچ کے باوجود ان کی محبت میں اس

ساری تشنگی اور محرومی کو پس پشت ڈال دیا تھا جو ماموں کی تمام تر محبت اور توجہ کے باوجود اس نے محسوس کی۔ پیرنٹ ڈے پے دل پر چرکے لگاتی اور سالگرہ پر ماموں کے دیے گئے تحفوں پر اس نے جو کمی محسوس کی وہ کبھی نہیں پوری ہو سکتی تھی کیونکہ وہ ماہ و سال کبھی پلٹ کر نہیں آسکتے تھے لیکن اب وقت کی طرح بابا سائیں پلٹ آئے تھے تو وہ ان کے آنے کی خوشی میں سب کچھ بھول گئی تھی، اسے سمجھوتہ کرنے کی پرانی عادت تھی اور بابا سائیں کا خیال تھا باقی سب بھی اسی طرح کا مزاج رکھتی ہیں لیکن دوپہر کو جب باقی بہنیں آئیں تو چار کو چھوڑ کر منجھلی والی امینہ حاکم اپنے ماہ و سال کا حساب لینے بیٹھ گئی۔ وہ جو ہمیشہ خاموش رہتی تھی آج بے تکان بول رہی تھی اور بابا سائیں تھے خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"امینہ پلیز، بابا سائیں کی طبیعت کا کچھ خیال کرو۔"

امینہ نے گھور کے عائنہ کو دیکھا پھر نخوت سے بولی۔

"کیوں صرف میں ہی کیوں کروں ان کا خیال، انہوں نے کبھی ہمارا خیال کیا؟ آخر ان کا تعلق ہی کیا تھا میری ماں سے، صرف اتنا کہ ہر سال دو سال بعد اماں کے پاس آکر اجازت نامے پر دستخط کرواتے اور نئی شریک سفر کے ساتھ چند قدم اور آگے بڑھ جاتے پیچھے اڑتی دھول سے بے پرواجوان کے سرپٹ دوڑنے سے اڑتی اور ہمارے وجود پر ایک گرد کی تہہ اور چڑھا دیتی، ایسی: ہم کہیں دکھائی ہی نہ دیتے۔ یہ ہیں عائنہ! ہمارے بابا سائیں جنہوں نے کبھی پروا نہیں کی ان کے ہوتے ہم کتنے لاچار و بے بس تھے، کتنے غیر محفوظ تھے۔ ایک بیٹے کی خواہش میں انہوں نے ہمیں کتنا رد کیا، ہے کیا ہم یہ سب بھول سکتے ہیں؟؟"

عائنہ نے کھینچ کر امینہ کو گلے سے لگا لیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بابا سائیں نے ہولے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ عائنہ کو چھوڑ کر ان کے سینے سے آ لگی۔ ہچکیوں سے روتے ہوئے بولی۔

"بابا سائیں! آپ نے ہمیں بھلائے رکھا مگر آج تک ہم اس پر قادر نہیں ہو سکے کہ آپ جو ہماری زندگی میں نہیں تھے تو ہم بھی آپ کو بھول جاتے۔ آپ کا وجود بظاہر ہماری پہنچ سے بہت دور تھا لیکن بابا سائیں! اماں سائیں کی باتوں میں اور ہمارے خوابوں میں ہمیشہ آپ کا ایک ہیولہ تراشیدہ رہا۔ آپ کے قدم ہمیشہ ہماری دہلیز پر ثبت تھے حالانکہ آپ نہیں تھے پھر بھی ہمیں لگا کہ آپ آنے والے ہیں۔ انتظار بہت جاں گسل ہوتا ہے بابا سائیں! آپ جانتے ہیں یہ۔!"

"ہاں، میں جانتا ہوں بیٹا! تب ہی تم تک تم سے ملنے آیا ہوں۔ انتظار صرف تم نے نہیں میں نے بھی کیا تھا مگر اس وقت مجھے اپنی احتیاجات اور جذبات کی سمت معلوم نہیں تھی یا پھر ایک وارث کا اس قدر خفقان تھا، اس شوریدہ خواہش کا مجھ پر اتنا اثر تھا کہ مجھے کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا، مجھے ہر اس چیز، ہر اس شخص سے نفرت تھی جو میری راہ میں رکاوٹ بنے۔ میں نے کتنے بے بس اور معصوم ہاتھوں میں آزادی کے پروانے پکڑائے۔ کتنوں کی خواہش کے قتل عام میں میری یہ خواہش ہراول دستہ رہی، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی، کبھی نہیں رہی تھی، مگر وہ واقعی پہچانا جاتا ہے۔ اس وقت زیادہ ہی جب اپنے ارادے اور عزم شکست خوردہ اور ریت کی دیوار ثابت ہوں۔ میں نے بھی اسے پہچانا، اس وقت جب میرے پاس ہارنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاں صرف ایک آس تھی کہ شاید میں ہار کر بھی جیت جاؤں، شاید میرا بھی کہیں انتظار کیا جاتا ہو، امینہ! بس یہی تمنا اس دہلیز تک لائی ہے مجھے لیکن تمہارا دل صاف نہیں تو میں تم پر بلکہ کسی پر بھی جبر نہیں کروں گا۔"

"نہیں بابا سائیں! ایسا تو نہ کہیں۔ آپ کا تو ہم پر بہت حق ہے۔ ہم آپ ہی کی محبت کا حصہ ہیں۔"

عائنہ حاکم نے بابا سائیں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا تو باقی چاروں بیٹیاں بھی ان کے قریب آ گئیں۔ ماموں نے مسکرا کر بابا سائیں کو مبارکباد دی پھر ہنس کر بولے۔

"حاکم بھائی! مانتے ہو نا بیٹیوں کے معصوم محبت کی کشش کو۔؟"

"ہاں افسر بھائی! واقعی یہ بیٹیاں بہت میٹھی اور شیریں، دل سے لگا کر رکھی جانے والی نعمت ہوتی ہیں۔ میں پتہ نہیں کیوں اتنے عرصے تک یہ کفران نعمت کرتا رہا شاید یہ بیماری بھی اس ناشکرے پن کا شاخسانہ ہے۔ یہ میری سزا ہی تو ہے افسر بھائی کہ میرے دل نے ابھی دھڑکنا سیکھا ہی تھا کہ اب رکنے پر کمربستہ ہے۔ میں اس شہد آگیں احساس سے روح کو سیراب کرنا چاہتا ہوں اور بلاوے کی گھنٹیاں ہیں کہ مسلسل بجے جا رہی ہیں ابھی تو میں نے انہیں ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں ہے، پیار بھی نہیں کیا اور۔"

"اور کچھ بھی نہیں ہے آپ کو! ڈاکٹر تو بکتے ہیں۔ اتنی پیاری پیاری بیٹیوں کے ہوتے بھلا آپ کو کیا ہو سکتا ہے۔ ہم ہیں ناں آپ کی ڈھال، آپ کا ہتھیار، آپ کے جینے کی آس۔"

بابا سائیں کی غلافی آنکھوں میں سکون لہریں لینے لگا مگر اس سکون میں غم آلود سکوت بھی تھا جیسے یہ سب کچھ محض دل بہلاوے کا سامان تھا ورنہ حقیقت میں زندگی گھونٹ بھر تو بچی تھی۔ سینے سے نکلتی تو پلٹتی یا نہ پلٹتی کیسے خبر تھی مگر وہ پھر بھی آس سے دل کو تھپکتے ہوئے کھلکھلاتی چہکارتی زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے کہ سچ تو یہی سب کچھ تھا وہ ہی تھے جو اس سے مکرتے آرہے تھے، اور وہ چھ کی چھ تھیں کہ دیوانوں کی طرح پھر لیے بناء ان سے اتنے لمبے عرصے کی دوری میں ہونے والے حادثے، خوشیاں سب ہی کچھ شیئر کر رہی تھیں، ان کی تنہائی پر بلک رہی تھیں اور انہیں دلاسے دے رہی تھیں۔

"یہ رشتہ کس قدر آفاقی، کس قدر حسین ہے۔" وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے سوچے جا رہے تھے اور وہ سب ان میں مگن تھیں۔ پورے خلوص اور سچائی سے۔

♥ ♡ ♡ ♥
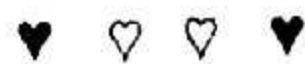
اس وقت وہ بستر پر اوندھا پڑا تھا۔ بظاہر اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن پھر بھی اس کے جذبات اس کے چہرے پر نقش تھے۔ لگتا تھا، وہ کسی اندرونی جنگ کا شکار تھا۔ کبھی رنگ سرخ پڑ جاتا، کبھی جلال سے یہ رنگ دو آتشہ ہو جاتا اور کبھی اس کے چہرے پر ملائمت آجاتی۔ بھوری مونچھوں تلے خوب صورت ہونٹ مسکرانے لگتے مگر مسکراہٹ گہری بھی نہ ہوتی کہ ہونٹ بے سبب بھینچ جاتے۔ چہرے کے خال و خد ایک بار پھر کھنچ جاتے۔ کتنی دیر سے وہ ان ہی خیالات کا شکار تھا کہ اچانک فلیٹ کا دروازہ کھلا۔ ایک نوجوان ہاتھوں میں کھانے پینے کا سامان لیے اندر داخل ہوا۔ دروازہ اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے کھولا تھا۔ بستر پر لیٹے ہوئے نوجوان نے صرف ایک بار سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر تکیے پر سر ڈال کر دوبارہ سے خیالات کا تانا بانا وہیں سے جوڑنے لگا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ آنے والے نوجوان نے سرسری سی نظر اس پر ڈالی پھر کچن میں سامان رکھ کر آیا اور اس کے قریب ہی بیڈ پر آرام سے بیٹھ گیا پھر ملائمت سے بولا۔

"تمہیں آج پھر بیزاری کا دورہ پڑ گیا۔ صبح تو اچھے بھلے تھے پھر یہ اچانک؟؟"

"بس ویسے ہی دل نہیں چاہ رہا کچھ کرنے کو۔"

"آخر دل کو ہوا کیا ہے؟" لحہ بھر کو وہ رکا پھر آہستگی سے بولا۔ "میں دیکھ رہا ہوں ضمان! تم اس شہر میں آکر یکسر بدل گئے ہو۔ ہم میں کوئی بات بھی راز نہیں رہی تھی لیکن یہاں آکر تم راز ہی راز بن کر رہ گئے ہو۔ جانے کیا کام ہے جو کرتے پھر رہے ہو مجھے تو کبھی کبھی ڈر لگنے لگتا ہے کہ کہیں تم۔"

"پاگل مت بنو، میں ایسے ہر کام کے خلاف ہوں جو میرے یا ملک کے لیے نقصان دہ ہو۔"

"پھر تم کیا کرتے پھر رہے ہو، مجھے کچھ پتا تو چلے، آج کل تو دفتر میں بھی نہیں بیٹھتے، سیدھے منہ بات نہیں کرتے، سچ بتاؤ کیا واقعی ہم اب بھی دوست ہیں یا کوئی بھی نہیں رہے ایک دوسرے کے؟؟"

ضمان حیدر یکدم اٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے مسکرایا۔

"آخر تمہیں یہ کیوں لگا کہ ہم ایک دوسرے کے کچھ نہیں رہے۔؟"

"بس ویسے ہی اس شہر کی بابت یہی سنا ہے۔ یہاں آنے والے عظیم اور گہرے رشتے بھی بھلا دیا کرتے ہیں۔ ہم تو محض دوست ہیں اور۔"

"اور والا رشتہ زیادہ مضبوط ہے۔ کیا ہماری محبت کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہمیں ایک ہی ماں نے جنم دیا ہے۔"

"میرے لیے شاید مگر دنیا کے لیے یہی سب سے زیادہ ناپائیدار رشتہ ہے۔"

"حالانکہ ہمیں اپنی زندگی اور محبتوں کو اپنے پوائنٹ آف ویو سے دیکھنا چاہیے۔ جب تمہیں ایسا نہیں لگتا تو پھر تمہیں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔"

"میں یہی کوشش کرتا ہوں کہ نہ سوچوں مگر جب تمہاری خفیہ کارگزاری دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں تمہارے لیے ڈسٹربنس کا سبب ہوں۔"

"احمق ہیں آپ اچھے خاصے۔ ایسے کیوں سوچتے ہو بھئی؟۔" اس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا تو سلمان اسے گھورنے لگا۔

"ضمان یہ میری برداشت سے باہر ہے۔"

"کیا بھئی؟" اس نے سگریٹ کو شعلہ دکھاتے ہوئے بے پروائی سے پوچھا تو وہ کچھ کہے بنا کچن میں چلا گیا۔ ضمان حیدر نے تپ کے تو دو تین کش لیے مگر پھر سگریٹ بجھا کر خود بھی کسلمندی سے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ ناراض نوجوان لائی ہوئی سبزی پر سارا غصہ صرف کر رہا تھا۔ ضمان حیدر کچھ دیر تو اسے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر اس نے اس کی پشت سے جا کر اس کے گلے میں بازو حمائل کر دیے۔

"ہٹو ضمان! تمہیں میری ذرہ بھر بھی پروا نہیں۔"

"ارے واہ مانی! تمہاری پروا ہی تو رہی ہے ساری عمر۔ دیکھ لو اس وقت بھی تمہاری مدد کے خیال سے کچن میں چلا آیا ہوں ورنہ تم تو جانتے ہو میں کتنا عدیم الفرصت ہوں۔" جواب پھر بھی نہ آیا تو اس نے گرفت مزید سخت کی۔

"او سلمان کے بچے! کیا تجھے اس پر یقین نہیں کہ میں عدیم الفرصت نہیں ہوں یا۔"

"مجھے تمہاری دونوں باتوں پر یقین نہیں ہے۔ چند الٹی سیدھی حرکتوں کو کام نہیں کہا جا سکتا اور میری پروا؟ تمہیں میری پروا کبھی نہیں رہی ہے۔"

"او ظالم انسان! کیا بکتا ہے۔ مجھے تیری پروا نہیں ہے۔ آخر یہ کیوں لگا تمہیں؟" سلمان حیدر نے گھور کے دیکھا پھر غصے سے دوبارہ پالک کی طرف متوجہ ہو گیا تو وہ اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"ہاں بھئی، اب بک بھی چکو۔ تمہیں ایسا کیوں لگا کہ مجھے تمہاری پروا نہیں رہی ؟"

"سامنے کی بات ہے اگر نظر آئے تمہیں تو۔ ہر وقت انجن بنے رہتے ہو پھر مجھ سے پوچھتے ہو اور جان جلانے کے لیے کیا تمہیں یہ نہیں پتا مجھے اسموکنگ کرنے والے لوگ کتنے برے لگتے ہیں اور شاید تمہیں یہ بھی پتا نہ ہو گا کہ اسموکنگ صحت کے لیے کتنی خطرناک ہے۔"

"اور اگر میں کہوں مجھے اس زندگی سے ہی نفرت ہے تو پھر ؟"

"تو میں کہوں گا تم ناشکرے ہو یا تمہیں خود ساختہ خود رحمی میں مبتلا رہنے کی عادت ہے ورنہ کیا نعمت ہے جو دنیا اور زندگی نے تمہیں نہیں دی۔"

"نعمت سے ہٹ کر کبھی تم نے اس کی اذیت کو شاید محسوس نہیں کیا۔ تمہیں ماں سے محبت تھی اور مجھے ماں سے عشق۔ سلمان! میں نے ماں کے آنسو دیکھے ہیں اور تم نے صرف ان کے قہقہوں، مسکراہٹوں میں زندگی کو محسوس کیا ہے یہی وجہ ہے تمہارے مقابلے میں میں زندگی سے زیادہ روٹھا ہوا اور زندگی کی طرف سے زیادہ تلخ ہوں۔"

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تلخی کا مطلب یہ نہیں کہ تم زندگی جیسے نعمت کو ٹھکرانے پر تل جاؤ، زندگی کی تلخی تمہارے لیے امرت بھی بن سکتی ہے اور تمہاری کامیابی بھی۔ اگر تم اس کے دیے ہوئے زخموں کو بھلا کر اپنے لیے خود پھول چن لو۔ یہ ہر

شخص کے لیے ایک سی ہوتی ہے ضمان! اس کے اندر محبت ہوتی ہے نہ وفا' لیکن ہمیں پھر بھی اس کا ساتھ دینا ہی پڑتا ہے اور جب یہ طے ہی ہے کہ دم آخر تک ہمیں ساتھ ہی رہنا ہے تو میرے خیال میں ہمیں اس کی بے وفائی اور بے مہری کے گلے کرنے کے بجائے اپنے لیے اس سے خوشیاں چھیننے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ خوش امیدی ایک موثر ماسٹر کی ہے جس سے ہر بند دروازہ کھولا جا سکتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو مگر میرے اندر جتنی نفرت ہے' وہ صرف انتقام سے پوری ہو سکتی ہے۔"

"حالانکہ انتقام اور نفرت تمہارے مزاج کے موافق ہی نہیں۔ تم ماں کی محبتوں سے گوندھے گئے ہو ضمان! تم اور نفرت یہ دونوں کبھی باہم نہیں ہو سکتے جیسے شک اور محبت ایک ساتھ دل میں قیام نہیں کر سکتے تم بہت اچھے انسان ہو پھر یہ انتقام کی رٹ اور خناس کیوں ہے تمہارے سر میں ؟؟"

"بس یہی میرا وعدہ ہے خود سے' اماں نے جب بظاہر آنکھیں بند کی تھیں مانی! تو میں نے ان کے اسٹریچر کی طرف اچٹتی سی نظر ڈال کر اندازہ کر لیا تھا کہ وہ آنکھیں اب کبھی نہیں کھلیں گی۔ ان آنکھوں کی تھکن بتاتی تھی مانی کہ وہ کس قدر اکتا گئی تھیں۔ زندگی سے۔ وہ میرے اور تمہارے لیے زندہ تھیں۔ پاپا کی محبت کا عہد لیے جی رہی تھیں مگر ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تو ان کے اعصاب نے "نیند نیند" کا شور ڈال دیا۔ وہ سو جانا چاہتی تھیں لیکن ان کے دل میں ہماری خوشیاں دیکھنے کی ہوک بھی تھی۔ ان کی تھکی آنکھوں میں ہماری شاداں فرحاں زندگی کا ایک خیال ہلکورے لیتا تھا مگر تھکن اس کے سامنے جیت گئی اور اور مانی! میں نے یہی انتقام لینا ہے اس کے ایک ایک عزیز سے کہ وہ بھی اسی طرح تل تل کر کے مرے' میں اپنی ماں سے کہیں زیادہ آنسو دیکھنا چاہتا ہوں اس کی آنکھوں میں۔"

کہتے کہتے یکدم وہ تھم گیا تو سلمان نے چھری رکھ اس کی تھوڑی اوپر کی پھر دھم سا بولا۔

"تو بہت سوچتا ہے ضمان! شاید اس لیے تجھے یہ سب کچھ قابل لگتا ہے ورنہ ہمارے مذہب میں معاف کر دینا زیادہ افضل ہے۔"

"ہاں مگر ان کے لیے جن کے پاس طاقت اور حوصلہ نہ ہو اور تم جانتے ہو نا میں کمزور ہوں نا بزدل۔"

سلمان حیدر اسے دیکھنے لگا۔ دکھ اور درد کی انتہا نے اسے کفر بکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اللہ کا حکم ٹھکرا رہا تھا۔ شاید ماں اس کے لیے سب ہی کچھ تھی اور وقت نے ماں چھین لی تو اس کی نظر میں ہر چیز غیر ضروری ہو گئی تھی' ہم رہا تھا تو صرف انتقام اور نفرت' اور نفرت واحد جذبہ ہے۔ جس میں بندہ کبھی دماغ سے نہیں سوچتا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دل سے کیے گئے کسی فیصلے کی سزا بھگتے لیکن یہ سب باور کرنے کے لیے موقع کی تلاش ضروری تھی سوئی الحال موڈ بحال کرنے کے لیے اس نے پالک کاٹ کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"اسے دھوؤ اچھی طرح۔ آج کے سالن میں کرکل آئی ناں تو بہت برا ہو گا۔"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ مسکرا رہا تھا' سوبھا گیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے' میں کیا خانساماں ہوں تمہارا؟۔"

"نہیں تم تو میرے ہیرو نمبرون ہو مگر اسمارٹی! پیٹ پوجا کے لیے یہ سب کرنا پڑے گا۔"

"آخر کیوں کرنا پڑے گا۔ یہ ہوٹل کس دن کے لیے بنائے گئے ہیں ؟؟"

"صرف پیسے کی بربادی کے لیے یا تمہارے جیسے کاہلوں کے لیے جو کام سے جان چراتے ہیں۔"

"بکو تو مت مجھ سا کامی بندہ بھی آج تک دیکھا ہو گا۔"

"ہاں دیکھ ہی رہا ہوں۔ مسلسل تین مہینوں سے روز صبح اٹھتے ہیں تیار ہوتے اور نکل جاتے ہیں۔ دوپہر کو اس وقت آتے ہیں جب سارے کالجز کی چھٹیاں ہو چکتی ہیں۔ اے ضمان کے بچے! کہیں تم آج کل کرل لو

کالج کے پھیرے تو نہیں لینے لگے ؟؟"

"بکو مت۔"

"کیوں نہ بکوں میرا دماغ ہل کر رہ گیا ہے۔ اچھا خاصا کاروبار ہے۔ منیجروں پر چھوڑ کر یہاں کرائے کے فلیٹ میں دھرے ہو' اوپر سے گارڈز فراہم کرنے کی ایجنسی کھول کر بیٹھ گئے ہو۔ آخر یہ سب ہے کیا؟ یہ تم گارڈز کیوں فراہم کرنے لگے ہو ؟؟"

"محض اس لیے کیونکہ یہ کراچی ہے مائی ڈیر اور یہاں یہی کاروبار زیادہ ان اور پاپولر ہے۔"

"لیکن تم تو دفتر میں بھی نہیں بیٹھتے۔ صرف مجھے ہی مکھیاں مارنی پڑتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں مار خان بننے کا مارجن تو ہے تمہارے پاس کرتے رہو خدمت خلق۔"

"یہ خدمت خلق ہے؟ اتنی مہنگی سیکورٹی مہیا کرتے ہو اور اسے تم خلق خدا کی خدمت پر محمول کرتے ہو۔ شاباش ہے تمہارے ڈھٹائی پر۔"

"ڈھٹائی ہی تو ہونی چاہیے' بڑے سے بڑا جرم معاف ہے آپ کو۔ یو نو مجرم کون ہے' وہ جو پکڑا جائے اور عقل مند وہ ہے جو ہمیشہ جرم کر کے بچ جائے۔"

"دیکھو' دیکھو تم نے پھر میرے خدشات کو ہوا دی ہے۔ ابھی تم کہہ رہے تھے۔ تم کوئی خطرناک کام نہیں کر رہے۔"

تو بابا میں خطرناک کام تو اب بھی نہیں کر رہا' میں نے تو تمہیں ڈھٹائی اور مجرم کی غرض وغائیت اور تھنکنگ بتائی ہے۔ رہا یہ کہ میری سیکورٹی ایجنسی مہنگی سیکورٹی فراہم کرتی ہے تو میری جان! ہمیں اس شہر میں اور اسی مہنگے سے دفتر میں بیٹھنا ہے اگر میں نے ذرا سی حاتم طائی فطرت ظاہر کی تو ہم دوسرے ہی دن سڑک پر دھرے ہوں گے اور کوئی ہمیں مفت میں بھی خریدنے کو تیار نہیں ہو گا۔" وہ ہنسا پھر سنجیدگی سے بولا۔

"مانی! تم ایک دم سیدھے ہو کیا نہیں جانتے جو شخص گارڈ رکھ سکتا ہے' وہ اسے رکھنا افورڈ کرتا ہے تب ہی اتنا بڑا قدم اٹھاتا ہے جب اس شہر میں پیسے کی گنگا بہہ رہی ہے تو ہم اگر اس میں نہالیں تو کیا برا ہے۔"

سلمان اسے دیکھے گیا پھر آہستگی سے بولا۔

"میں نہیں سمجھ سکا تم کیا کرنے والے ہو اور کیا سوچے بیٹھے ہو۔ تم ضمان! تم کبھی دولت کو سب سے آخری مارجن گردانتے تھے شخصیت کا' تم کہتے تھے دولت سے وہ مرعوب کرتے ہیں جن کی شخصیت میں اور کچھ نہ ہو جو خالی ڈبے کی طرح ہوں تو دولت کی گل کاری ہی ان کی شخصیت پہ بیل بوٹے بناتی ہے مگر آج یہ تم ہی ہو کہ دولت پر گھنٹہ بھرے رطب اللسان ہو میں کیا سمجھوں اس سے۔ پتہ نہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔" اس نے پالک پتیلی میں ڈال کر سنک میں نلکے کے نیچے رکھا پھر دوسری خالی پتیلی میں دھو دھو کر ڈالنے لگا' اس کے ہاتھ بہت تیزی سے چل رہے تھے اور ضمان نہایت انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا پھر ضبط نہ ہو سکا تو شرارت سے بولا۔

"مانی یار! سچ ماں نے تو تجھ میں پورا کا پورا اپنا آپ اتار دیا ہے۔ تو ہم میں سے تو بالکل نہیں لگتا' سر سے لے کر پیر تک ایک پتی ورتا قسم کی لڑکی لگتا ہے۔"

"بس بس۔ کام ہوتا نہیں زبان چلانے میں ماہر ہو۔ چلو ہٹو یہاں سے۔ مجھے سالن بھی پکانا ہے۔"

"ارے واہ! بالکل لڑکیانہ ٹون میں بولنے لگا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں کسی دن مجھ پر کچھ اور ہی انکشاف نہ ہو جائے کہ میں۔"

"فضول بکنے سے بہتر ہے اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ اپنے ہاتھوں سے کام کرنا کوئی بری بات نہیں اور سچ پوچھو تو یہ ساری آفت تمہاری لائی ہوئی ہے۔ اچھا بھلا رہتے تھے لاہور میں۔ دائیں بائیں نوکروں کی فوج ظفر موج تھی مگر نہیں جناب! سکون آپ کی گھٹی میں ہے ہی کہاں' بس بے سروسامانی میں آپڑے یہاں بنا سوچے سمجھے۔ وہ تو شکر کرو ماں کی مدد کی غرض سے کچن میں ان کا ہاتھ بٹانے سے گھر سنبھالنا' کھانا پکانا آتا تھا ورنہ ہوٹلوں کے وہ بد مزہ کھانے کھانے کو ملتے کہ نانی یاد آجاتی۔"

"مگر کیوں؟ صرف نانی کیوں یاد آتی ہیں ہر مشکل میں۔ دادی کیوں یاد نہیں آتیں۔ کیا دادی الجبرا کا سوال

ہوتی ہیں ؟؟"

"پتہ نہیں۔ چلو ہٹو یہاں سے۔"

اس نے زبردستی اسے کچن سے دھکیلا اور وہ اسے ایک عظیم انسان کا تمغہ تفویض کرتا اپنے بیڈ روم میں چلا آیا۔ چہرے کی بشاشت اور مسکراہٹ یکدم ہی پتھریلی سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے دروازہ بند کر لیا پھر ٹیلی فون اپنی طرف کھسکا کر ایک نمبر ڈائل کیا۔ پہلی بیل پر ہی ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو! جی کس سے بات کرنی ہے ؟؟"

"تم سے ہم صبح والی بی بی ہو نا ؟؟"

"جی! آپ آپ کون بول رہے ہیں ؟۔"

"تمہارا دشمن' جو سایہ بن کر ہر وقت تمہارے ساتھ پھرتا ہے مگر سن لو' اب تم مجھ سے بچ نہیں سکو گی۔ میں تمہیں کڈنیپ کر لوں گا۔"

"کیا فضول بکواس ہے یہ۔"

"عائنہ! کون ہے بیٹا۔ کیا ہوا عائنہ ؟۔" مختلف آوازیں اطراف میں بکھرنے لگیں تو اس نے جنونی قہقہہ لگا کر ریسیور رکھ دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو دروازہ کھولے سلمان حیرت سے بت بنا کھڑا تھا۔

"یہ تم لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کب سے لگے ہو۔ آخر اس کا مقصد ؟؟"

"یہ مقصد میں اچھی طرح جانتا ہوں' سو ضروری نہیں کہ اس مقصد سے تمہیں بھی آگاہ کروں۔"

"تم ہوش میں تو ہو۔ تم کس سے بات کر رہے ہو۔ کیا بھول گئے میں کون ہوں ؟؟"

"نہیں' میں بھولتا ہی تو نہیں ہوں مانی! میں بھول جانا چاہتا ہوں مگر نہیں بھول سکتا اور یہی دوہری کیفیت ہے جو مجھے مارے ڈال رہی ہے۔ میں تم سے بھی مس بی ہیو کرتا ہوں' اکثر کرتا ہوں مگر مجھے خود پر اختیار نہیں رہتا' میں مجبور ہوں مانی! مجھے معاف کر دو۔ میں واقعی برا ہوں' ہے ناں' واقعی بہت برا۔"

"بکو مت' میرے بھائی ہو کر تمہیں جرأت کیسے ہوئی خود کو برا کہنے کی' یہ جو وجود ہے ناں یہ صرف تمہارا نہیں ہے' اس کے جملہ حقوق ماں نے مجھے بھی تفویض کر رکھے ہیں سو تنہا تم اپنے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں۔" یہ کہتے ہوئے کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"کون کہتا ہے اس چہرے کو برا۔ اتنا پیارا من موہنا سا تو روپ ہے تمہارا۔ جو ایک بار دیکھ لے تمہارا اسیر ہو جائے۔"

ضمان نے لگا کچھ سنا ہی نہیں' کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا پھر پلٹ کر بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا چہرہ واقعی ایسا ہی ہے کہ جو دیکھ لے اسیر ہو جائے۔ کبھی کبھی تو میرا چہرہ مجھے بھی بہت پرکشش لگتا ہے۔ سوچتا ہوں اگر ماں نے اس چہرے کے پیچھے دھوکا کھایا تو وہ واقعی بے خطا تھی مگر میں کیا کروں مانی! مجھے اسی لیے خود سے حد درجہ نفرت ہے کہ میرا چہرہ اس شخص کا پرتو ہے جس سے مجھے انتقام لینا ہے۔"

"پھر انتقام۔ آخر تمہارا یہ سرسام کب اترے گا ؟؟"

"شاید کبھی نہیں یا اس وقت جب میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا اور تم دیکھنا میں یہ جنگ ضرور جیتوں گا۔"

"چاہے اس جنگ میں جذبوں' رشتوں' مان اور بھرم کی لاشیں یہاں سے وہاں تک بکھری رہ جائیں ؟؟"

"ہاں۔ چاہے ایسا ہی کیوں نہ ہو۔ میں پیچھے نہیں ہٹوں گا اور پھر مانی یہ تو ہوتا ہی ہے ہر جنگ میں اور اس کے اختتام کے بعد یہی سب کچھ ہوتا ہے چند لاشیں' خون اور ناشاد آرزوؤں کی مٹھی بھر راکھ' یہاں سے وہاں تک چکراتی ہوئی۔ یہی کچھ حاصل ہے جنگوں کا۔ ازل سے اور شاید ابد تک۔"

سلمان نے دلگیری سے اپنے ماں جائے کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر کمرے سے نکلتا چلا گیا کہ اس وقت یہی بہتر تھا۔

*_*_*

عائنہ نے جب سے وہ ٹیلی فون ریسیو کیا تھا تب سے مسلسل روئے جا رہی تھی اور بابا سائیں پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ آخر کون شخص ہو سکتا ہے وہ جس نے ان کی بیٹی کو دھمکی دی۔ مسلسل ایزی چیئر پر وہ پیشانی پر ہاتھ دھرے اب تک کے تعلقات اور دشمنیوں کو گن رہے تھے مگر واضح جواب ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ کبھی انہوں نے کسی سے برا رویہ نہیں رکھا تھا اور دنیا میں سارے ہی ان کے دوست تھے بلکہ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے زعم اور غرور میں کبھی کسی سے اچھا سلوک روا ہی نہیں رکھا تھا' ان کا کوئی دوست تھا ہی نہیں۔ وہ سارے جہان میں اجنبی تھے۔ یا کوئی تھا ان کا تو بغض و عناد سے بھرے دشمن اور ان کی تعداد اتنی تھی کہ بابا سائیں کو شمار کرنا مشکل ہونے لگا تھا۔

"کون ہو سکتا ہے وہ ؟؟" بابا سائیں نے پوری آنکھیں کھول کر عائنہ کو دیکھا۔

ایک لمحے کو خیال ہوا کہیں اس کی ذاتی جان پہچان ہی نہ وجہ دشمنی بن گئی ہو مگر اس کے تقدس سے دمکتے چہرے کو دیکھ کر ان کا دل انکاری ہو جاتا۔

"نہیں عائنہ اس رکھ رکھاؤ کی نہیں اس میں تو ایک ٹھہراؤ ہے' کسی ندی کا سا نہیں' سمندر کا سا ٹھہراؤ اور جو سمندر ہو کر اپنی حد اور اپنے ظرف کا پیمانہ ہر وقت تھامے رہے' وہ منہ زور موجوں کی طرح کیسے چھلک سکتا ہے۔"

"پھر کون ہے ؟ کون ہو سکتا ہے ؟۔" انہوں نے پرسوچ نگاہوں سے پھر سے عائنہ کو دیکھا پھر مدھم سا پکارے۔

"سنو عائنہ! تم کل کالج نہیں جاؤ گی۔"

"بابا سائیں! یہ کیوں ؟ کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ۔" بابا سائیں کے وجود میں ایک ٹیس اٹھی۔ بیٹی کی شرافت کا اعلان کرتی اور اس کے خیال کو رد کرنے والی ٹیس اور اٹھ کر وہ اس کے قریب چلے آئے پھر سر پر ہاتھ رکھ کے آہستگی سے بولے۔

"میرا وقار تم سے ہے عائنہ! میں نے کبھی عزت اور وقار کو مشکل نہیں دیکھا لیکن اگر اس کی کوئی صورت بنتی ہو گی تو وہ میری بیٹیوں کا ہی پرتو ہو گا۔"

"بابا سائیں!" اس نے بابا سائیں کا ہاتھ تھام کر

رونا شروع کر دیا تو وہ قریب ہی بیٹھ گئے۔

"پھر بولے۔" میں نے تمہیں کل صرف اس لیے جانے سے روکا ہے کہ میں سمجھ نہیں سکا اس فون کال کو۔ بیٹا! یہ مشہور سہی کہ گرجنے والے بادل برسا نہیں کرتے لیکن کون جانے گرجنے والے بادل گرجنا بند کر کے کب برسنا شروع کر دیں۔ اس لیے میں اس کال کو محض دل لگی یا ڈراوا نہیں سمجھ سکتا اور تمہیں میرے ماضی کے باعث تکلیف پہنچے میں یہ بھی نہیں برداشت کر سکتا۔"

"پلیز بابا! یوں نہ کہیں، مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔"

"ہونی بھی چاہیے تمہیں شرمندگی ہونی ہی چاہیے بیٹا! میرا ماضی بہت داغ دار ہے لیکن اب تو میں تائب ہو چکا ہوں ناں پھر میرے اعمال میرے بچوں کو ہراساں کرنے کے لیے کیوں صورتیں بگاڑ رہے ہیں۔"

"بابا سائیں! فار گاڈ سیک۔ آپ خود کو مورد الزام نہ ٹھہرائیں۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جائیں۔"

"کیا واقعی میرے بھول جانے سے میرا ماضی بھی سب کے ذہنوں سے وقت کے صفحات سے اور لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے گا؟ نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ آج تک ایسا ہوا ہی نہیں ہے مگر اس میدان کا ہر شہسوار یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک الگ تاریخ رقم کرے گا۔ وہ بدنامی کو شہرت اور سنگ دلی کو اعلیٰ نسب کی خاندانی وراثت پر محمول کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہیں ترازو ہے۔ جو اس کے ہر عمل کو انصاف پر تول رہا ہے اور اس کی کج خلقی، سنگ دلی، بے راہ روی وہ باٹ ہیں جن کے وزن سے اس کا خسارہ دوچند ہے۔ اتنا زیادہ کہ وہ رب جو صرف رحمت ہے وہ بھی اس پر نظر کرم ڈالنے کو تیار نہیں لیکن عائنہ! افسوس یہ سب اس وقت میں سمجھ آتا ہے جب ہمارے پاس نہ وقت ہوتا ہے نہ مہلت۔"

"نہیں بابا سائیں! وقت اس وقت تک آپ کا ہے، مہلت آپ کے لیے ہے جب تک آپ بستر مرگ سے پہلے تائب ہو جاتے ہیں۔ توبہ کا در کبھی بند نہیں ہوتا بابا سائیں! اور یہ وہ عنایت ہے۔ جو کسی کسی پر

اتارتا ہے وہ رب، رہی وقتی پریشانی تو میں پریشانیوں کو انسان کو مضبوط کرنے اور اس کی صلاحیتوں کو جلا دینے کا نامحسوس عمل گردانتی ہوں یہاں تک کہ وہ عمل ہی ہمارے لیے جزا بن جاتا ہے۔"

"عائنہ! میری بچی! اس قدر پیاری ہے تو اور اس سے خوبصورت ہیں تیری باتیں لیکن پھر بھی ایک باپ کا دل تسلی پانے میں ناکام ہے۔"

"محض اس لیے کہ ابھی تک آپ نے میرے عزم اور حوصلے کو ناپا نہیں ہے اس خدا کی عظمتوں اور اس کی حاکمیت کو مانا تو ہے تسلیم بھی کیا ہے مگر اسے محسوس نہیں کیا۔ ہر چیز محسوس کرنے سے عظیم ہوتی ہے بابا سائیں! یہ احساس ہی تو ہے جو آپ کو اشتباہ خرد و نظر سے بچالیتا ہے۔ سراب اور حقیقت میں تمیز سکھاتا ہے۔ احساس انسان کی کیمسٹری کی ماسٹر کی ہے بابا سائیں! جس سے ہر تالا کھل سکتا ہے۔ احساس ہی تو انسان کو حیوان سے بلند تر کر کے اشرف المخلوقات بناتا ہے "خدا ہے" کو ایک بامعنی اور ٹھوس دلیل دیتا ہے۔ یہ تو سب سے بڑا انعام ہے بابا سائیں۔"

"ہاں مگر یہ صرف تمہارے جیسے سادہ اور پاک دلوں پر اتارا جاتا ہے عائنہ! میرا دل تو بڑا ہی سیاہ ہو چکا ہے، زنگ آلود سا ایک بے کار سا دل۔"

"نہیں، بس اب کبھی یہ نہیں کہیں گے آپ۔" لمحہ بھر کو رکی پھر سعادت مندی سے بولی۔

"آپ اپنی قدر میرے دل سے پوچھیں بابا سائیں! میں نے بلکہ ہم بہنوں نے جس طرح آپ کے وجود کی آس باندھی، آپ کے آنے کی دعائیں کیں بلکہ ہماری دہلیز پر ہماری دعائیں آج بھی ہاتھ اٹھا کر سہمی کھڑی ہیں اس خوف سے کہ کہیں یہ کوئی خواب نہ ہو، رہا آپ کا حکم تو وہ سر آنکھوں پر لیکن سوچیے بابا سائیں یہ کسی مسئلے کا مستقل حل تو نہیں۔"

"پھر تمہارے ذہن میں اس کا کونسا مستقل حل ہے؟"

"میرے ذہن کی پوچھتے ہیں تو سب سے پہلا اور آخری آسرا اللہ کا ہے لیکن اگر کسی سیکورٹی ایجنسی سے رابطہ کیا جائے تو کیسا رہے گا؟"

بابا کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "ہاں یہ صحیح رہے گا میں ابھی فون کرتا ہوں کسی ایسے گارڈ کے لیے جو تم ساری بچیوں کا تحفظ کر سکے۔" "تمہیں تمہارے تعلیمی اداروں میں بہ حفاظت پہنچا سکے" بابا سائیں نے فون اپنی طرف کھسکا لیا۔

دو تین سیکورٹی ایجنسیز سے معاملہ کرنے کی کوشش کی مگر کہیں بات نہ بن سکی۔ بالآخر اخبار میں دیکھ کر "زی ایس سیکورٹی" ایجنسی کا فون نمبر ڈائل کیا اور بات کرتے ہی انہیں محسوس ہوا جیسے بولنے والے کی آواز ہی تحفظ کا منبع ہے سو فوراً ہی انہوں نے بات چیت طے کر لی۔ تمام معاملات طے پا گئے تو وہ اس گارڈ کا انتظار کرنے لگے جسے ایجنسی نے ان کے لیے ہائر کیا تھا۔ ٹک ٹک کر کے کتنا ہی وقت بیت گیا تب کہیں ملازم نے گارڈ کی آمد کی اطلاع دی اس وقت جب وہ سب کھانے کی میز پر تھے۔

"ٹھیک ہے۔ تم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ ہم آتے ہیں۔" بابا سائیں بولے پھر جلدی جلدی کھانا ختم کر کے بابا سائیں اور ماموں ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ گئے اور عائنہ حاکم آمنہ اور وہ سب بہنیں ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے گارڈ کو دیکھنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے پر کمربستہ تھیں۔ لمبا اونچا سا نوجوان گھنی مونچھوں، فرنچ کٹ داڑھی اور عینک سمیت انہیں عجیب سا لگا۔

"آپی یہ! یہ ایسا ہوتا ہے گارڈ؟"

"پتا نہیں آج سے پہلے میں نے بھی کوئی گارڈ نہیں دیکھا، شاید ایسا ہی ہوتا ہوگا۔" عائنہ نے بدقت کہا۔ تو آمنہ اسے ٹہوکا دینے لگی۔ عائنہ! یہ شخص تو صرف شاعر لگ سکتا ہے یا پروفیسر اس سے بھلا مجرم کہاں ڈریں گے۔

"بات تو سوچنے کی ہے لیکن کیا پتہ یہ بھی اس کی پروفیشنل ڈریسنگ کا حصہ ہوں۔"

"بات ڈریسنگ کی نہیں شکل کی ہے۔ سچ اپیا اس کو دیکھ کر تو خواہ مخواہ رحم آتا ہے۔"

"بکواس نہیں۔ ہمیں بابا کا حکم اور ان کی رائے دیکھنی پڑے گی جو وہ فیصلہ کریں۔"

"لیکن اگر بابا سائیں نے اس آرٹسٹ بندے کو گارڈ مقرر کر لیا تو؟؟"

"تو اچھا ہوگا، ظاہر ہے بابا سائیں کچھ تو دیکھ کر ہی اسے گارڈ مقرر کریں گے۔"

"مگر مجھے نہیں لگتا کہ یہ شخص اسلحہ چلانا بھی جانتا ہوگا۔"

"سوچنے کی بات ہے لیکن خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" عائنہ حاکم نے کندھے اچکائے تو وہ سب کمرے میں آ بیٹھیں اور ایک گھنٹہ بعد بابا سائیں بتا رہے تھے کہ انہوں نے "ذی جاہ" کو ان کا گارڈ مقرر کر دیا ہے۔

"اف وہ، نام بھی تو شخصیت سے میچ نہیں کرتا۔"

"بکومت عائنہ! اچھا خاصا لمبا تڑنگا بندہ ہے بس چہرے سے کچھ مسکین تو لگتا ہے اور بات ہے۔"

"ہاں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں اس کے ڈیل ڈول پر تو شیر افگن، رستم، سہراب یا اسفند یار جیسے نام زیادہ جچتے۔ ویسے اب بھی ایک ابہام ہے۔ کیا واقعی یہ ڈیل ڈول کے مطابق ہی ری ایکٹ کر سکے گا یا مجرم ہمیں اغوا کر رہے ہوں گے اور جناب انسانیت کا سبق سناتے ہوئے فرمائیں گے ___ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال بھی اس کے سامنے کرو اور یوں ہم سب فری میں کڈنیپ۔ کیا سمجھیں اپیا؟؟"

غانیہ نے سنجیدگی سے کہا تو عائنہ ہونق ہو گئی۔ سیرچ تھا وہ اپنی عمر سے زیادہ دور تک سوچتی تھی لیکن اس کی سوچ اور شخصیت میں کبھی نہیں بنی تھی، وہ کہتی عموماً خلیل جبران کو ذہن میں رکھ کر مگر عمل کرنے کی باری آتی تو اس کی سانس اٹکنے لگتی۔ یہ کالج ہی کی بات تھی کتنے مہینے وہ سب اس کی ہمت بڑھاتے رہے تھے۔

"کچھ نہیں ہوتا آپی! سب لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ اب ہر شخص تو آپ کو اغوا کرنے کے لیے نہیں کھڑا ہوگا۔"

عالیہ کہتی۔ "اور کیا اپیا! اب ان کا ٹیسٹ اتنا بھی خراب نہیں۔" تو وہ بھنا جاتی اور یہ بھناہٹ، جھنجلاہٹ اور غصہ ہی تو تھا جس نے اس کو اتنی ہمت بخشی کہ وہ کالج جانے لگی ان سب کے مذاق کو غلط

ثابت کرنے کے لیے مگر دل ابھی تک پہلے دن کی طرح دھڑک اٹھتا تھا پھر اس معاملے پہ وہ کیسے یکدم سپرمین بن جاتی، حالانکہ سرتاپیر دل تا روح وہ ایک مکمل لڑکی تھی، بزدل اور دیوسی لڑکی کسو آنکھیں خلا میں ٹکائے وہ غانیہ کو تکنے لگی۔

اور امیمہ حاکم نے چٹکی بجا کر اسے چونکایا۔ "عائنہ کیا سوچا پھر، یہ شخص تو قطعاً "موزوں نہیں لگ رہا۔"

"پھر! پھر کیا کریں؟"

"بابا سائیں کو اپنا خدشہ بتاتے ہیں اور کیا کریں گے۔ جب ہم مطمئن نہیں تو بس۔"

"ٹھیک ہے میں بات کروں گی۔" اس نے معاملہ ختم کر دیا، پھر رات گئے بابا سائیں سے یہ معاملہ ڈس کس کیا تو بابا سائیں خاموشی سے کتاب پر نظر جمائے بیٹھے رہے اور ماموں جان کھنکھار کے بولے۔

"مجھے عائنہ کا خدشہ بے بنیاد لگتا ہے بھائی جان! ضروری نہیں ہر گارڈ جیل سے چھوٹا قیدی ہی ہو، آپ نے اس کے کاغذات تو دیکھے ہی تھے ناں وہ ایک ریٹائرڈ فوجی ہے۔"

"اتنی سی عمر میں ریٹائرڈ؟ بابا سائیں کوئی تو وجہ ہو گی اس کی برخاستگی کی۔"

"نہیں کوئی خاص نہیں تھی۔ اچھا بھلا کمیشن مل گیا تھا مگر بس مزاج کی تیزی کے باعث کام خراب ہو گیا۔ ایک بار فائل خراب ہو جائے تو پھر اچھائی کی توقع نہیں مگر یہ پھر بھی لگا رہا، کیپٹن کے عہدے تک پہنچ گیا تھا کہ پھر زبردست چپقلش پر اس کی تنزلی ہو گئی۔ بس تب سے خار کھا گیا اور استعفیٰ دے دیا۔ کافی عرصہ تک اس کا کیس ہاٹ کیس رہا تھا، سب دوستوں کی اس کو ہمدردی و حمایت حاصل تھی مگر دل برا ہو گیا تو کسی کی نہ سنی۔"

"مگر بابا! یہ سب تو اس کی کہی ہوئی باتیں ہیں۔ آپ نے کہیں سے تصدیق کی اس کی؟"

"تصدیق کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے پاس تمام کاغذات موجود ہیں جو اس کی باتوں کو سچ ثابت کرتے ہیں۔"

"پر بابا سائیں! آج کل جھوٹے جعلی کاغذات بنانا کیا مشکل ہے اور پھر یہ کراچی ہے ― بابا سائیں"۔ بابا سائیں نے غور سے دیکھا اور ماموں نے جھلا کر کہا۔

"آخر تم کیا چاہتی ہو عائنہ؟"

"صرف اتنا ہی کہ مجھے اس شخص پر اعتبار نہیں، بابا سائیں! آپ نے اسے غور سے دیکھا ہے؟ آپ کو نہیں لگتا کہ ہم نے پہلے بھی اسے دیکھا ہے بہت جانا پہچانا سا چہرہ ہے۔"

"ہاں، مجھے محسوس ہوا تھا لیکن یاد نہیں آ رہا کہ کہاں دیکھا تھا مگر اسے ریجیکٹ کرنے کی یہ وجہ تو نہایت نامعقول ہے۔" بابا سائیں نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

*_*_*

"کیا ہوا یہ تم اس قدر خاموش کیوں بیٹھے ہو؟" سلمان حیدر نے ریسور رکھ کر نہایت خضوع و خشوع سے خاموشی کو خراج تحسین پیش کرتے ضمان حیدر سے سوال کیا تو وہ یوں چونک کر اسے دیکھنے لگا جیسے وہ ابھی تک یادداشت سے منہا تھا۔

"اب بول بھی چکو۔ کس کا فون تھا؟" اس نے پھر سے اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔

"مسٹر حاکم سرور کا فون تھا۔ وہ کہہ رہے تھے انہوں نے مجھے ملازمت دے دی ہے۔"

"یعنی ___" چند لمحے رکا اور پھر کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا پھر سرسراتے لہجے میں پکارا۔

"اب سمجھا، یقیناً" یہی بات ہے نا جو میں سمجھا ہوں۔؟"

اس نے طویل سانس لی پھر سر ہلا کر بولا "تم درست سمجھے یہ ہی وجہ ہے شہر بدر ہونے کی اتنی تکلیفیں اٹھانے کی اور یہ سیکیورٹی ایجنسی کھولنے کی۔ صرف اس شہر میں ایک اسی شخص کو تو ٹریس کرنا چاہتا تھا میں محض اس شخص کو تو میں ڈھونڈتا رہا ہوں کبھی پایا کبھی کھو دیا لیکن سنا ہے اب مسٹر حاکم سرور اسی شہر میں مقیم رہیں گے کیونکہ ان کا دل ڈیمیج ہو چکا ہے اور ہر وقت انہیں دیکھ بھال اور فوری ڈاکٹری امداد کی ضرورت رہتی ہے۔"

"تو؟"

"تو کیا؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

وہ آہستگی سے بولا "صرف اتنا ہی کہ جو شخص خود مکافات عمل سے گزر رہا ہو، اسے مزید کانٹوں میں کھینچنا کہاں کا انصاف ہے۔"

"پتا نہیں یہ انصاف ہے یا نہیں لیکن ماں کے آنسو تم بھول سکتے ہو میں نہیں، جب تک ان کی آنکھوں میں اس جیسی برسات کی جھڑی نہ لگا دوں، مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"میں نے دو تین دن سے تمہاری مصروفیات کا حساب لگایا ہے اور مجھ پر یہ راز آشکار ہے کہ وہ تم ہی تھے جو اس لڑکی کو تنگ بھی کرتے تھے۔"

وہ مزید آہستگی سے بولا "ضمان! کیا یہ سب غلط نہیں۔ جنہیں تم واقعی تحفظ دے سکتے ہو۔ انہیں ہراساں کر رہے ہو۔ ان کے دلوں کو ہر پتے کے کھڑکنے پر خوف زدہ ہوتا دیکھنا چاہتے ہو۔ کیا یہ کوئی اچھی بات ہے؟"

"نہیں! مگر آج کل میں نے انسانیت کا سبق پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ چلتا ہوں۔" کیپ جما کر وہ باہر نکل گیا۔

وہ خاموشی سے اپنے کام نمٹا رہا تھا مگر عائنہ حاکم مکمل طور پر اس پر مرکوز تھی۔ پتہ نہیں عائنہ حاکم کی آنکھوں میں اتنے شکوک کیوں تھے۔ وہ کافی دیر تک کن اکھیوں سے اسے دیکھتا رہا پھر مؤدبانہ بولا۔

"کیا ہوا بیگم صاحب! ہم سے کوئی غلطی ہو گئی؟"

عائنہ حاکم نے چونک کر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلا کر کار سے اتر گئی اور وہ اسے کالج میں داخل ہوتے دیکھتا رہا۔ سارے کام معمول کے مطابق ہی چلتے رہے۔ وہ وہیں کوارٹر میں رہ پڑا مگر جب بھی حاکم سرور کو دیکھتا اس کی آنکھوں میں سرخی بڑھ جاتی جسے وہ عینک کے پیچھے چھپا لیتا اور امیمہ حاکم، عائنہ حاکم کے کان میں گھس کر پوچھتی۔

"یہ ہمارا گارڈ رات کے وقت بھی کالی عینک کیوں لگاتا ہے؟" عائنہ حاکم کاندھے اچکا دیتی تو وہ بسور کر رہ جاتی پھر اچانک ایک دن اس نے یہی سوال خود اس سے کر دیا تو کتنی ساعتوں اس سے بولا ہی نہیں گیا پھر سنبھل کر بولا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے بی بی صاحب! یونہی روشنی اچھی نہیں لگتی۔" پشت موڑ لی تو دل میں بڑبڑایا۔

"روشنی! واقعی بعض لوگوں کے چہروں پر روشنی اچھی نہیں لگتی، اس لیے ان چہروں کو تاریک کرنے سے پہلے تاریک دیکھنے کی خواہش اسی طرح پوری ہو سکتی ہے سو کر لیتا ہوں مگر حقیقت میں ان پر کالی رات نہ لایا تو کچھ نہ کیا۔" عائنہ حاکم اس کے انداز میں عجب تحکم دیکھ کر گھبرا جاتی۔

"یہ گارڈ یوں نہیں لگتا جیسے کسی ایسی سلطنت میں آ گیا ہے جس کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں اور یہ اپنے زعم اور غرور کا پھریرا لہراتا اپنی فتح کے ڈنکے بجاتا ہوا حکومت کے لیے آ موجود ہوا ہے۔" امیمہ ہاں میں ہاں ملاتی۔

"ٹھیک کہتی ہو تم، اس کا انداز ملازموں والا نہیں حاکموں والا ہے۔ تمہیں پتا ہے ملازمت کے پہلے دن کیا کہا تھا اس نے؟"

عائنہ سوالیہ ہو جاتی تو امیمہ آہستگی سے کہتی "کہتا تھا صاحب ہم یہاں ملازم ضرور ہوئے ہیں لیکن آپ ہم پر بے جا رعب مت ڈالنا ہم پوری ایمانداری سے نوکری کرے گا لیکن اگر ہمیں جانور سمجھ کر سلوک کرو گے تو ہم بھی پٹھان ہیں۔ دماغ گھوم گیا تو کچھ بھی کر بیٹھیں گے۔ صرف مجبوری نے یہاں لا پٹخا ہے ورنہ اعلیٰ تعلیم بھی ہے اور خاندانی نجابت بھی ہے ہمارے پاس۔"

"اچھا یہ کہا اس نے؟ بابا سائیں نے پھر بھی اسے رکھ لیا؟" پھر فکر سے بولی۔

"امیمہ! مجھے اس کا انداز بہت پراسرار لگتا ہے۔ پتہ نہیں عجیب طرح کا تحفظ ہے اس کی ذات میں، کبھی لگتا ہے چلچلاتی دھوپ میں بے سائبان ہیں اور کبھی لگتا ہے وہ ہمارے ساتھ ہو گا تو ہر مصیبت پریشانی اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔"

"ہاں ایسا ہی لگتا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہے یہ شخص۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو جاتی تو وہ جو ان کی باتیں

سنتا رہتا تھا روزانہ ہی ان کے خیالات پر ہنستا رہتا ان کے خیالات کی پاکیزگی چند لمحے کے لیے اسے روک روک لیتی لیکن ماں کا چہرہ یاد آجاتا تو اسے سب بھول جاتا۔

وہ اپنی مصروفیات میں لگا رہتا پھر چند ماہ ہی میں ان سبھوں نے دیکھا تھا کہ وہ بابا سائیں کا دست راست بن گیا تھا۔ گارڈ کے ساتھ ساتھ وہ ان کا مشیر بھی تھا اور بابا سائیں اس کی صلاح کے بغیر کوئی کام نہ کرتے۔ ماموں یہ حالت دیکھتے تو کہتے۔

"عاصمہ! حاکم بھائی کو سمجھاؤ، کسی باہر کے آدمی پر اتنا اعتبار کرنا ٹھیک نہیں۔"

وہ سنتیں مگر کیا کہتیں۔ خاموشی سے بھائی کو اور اس کے مشورے کو دل میں وزنی محسوس کرتے ہوئے بھی خاموش رہتیں۔ بہت عرصے بعد تو ان کی شخصیت کو اعتبار اور مان ملا تھا پھر وہ کیسے اسے محض ایک اجنبی شخص کی مخالفت میں گنوا دیتیں اور یہ تو طے تھا انہیں اب تک اس شخص سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا بس اس لیے خاموشی سے وہ تیل کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ تیل کی دھار کو دیکھے جارہی تھیں اور وہ نیا گارڈ لفظوں کی بوند بوند سے بابا سائیں کے دل کو جیتے چلا جارہا تھا یہاں تک کہ اس ٹیم کا ٹرننگ پوائنٹ آگیا۔ اس نے نہایت مہارت سے عین پروگرام کے تحت گمنام فون کال کے ذریعے اغوا برائے تاوان کے عادی گروپ کو ہائر کیا اس شرط کے ساتھ کہ مزاحمت میں بھی قتل و خون نہ ہو۔ ہاں زخمی کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بھی انتہائی صورت حال میں وقوع پذیر ہو، سو تمام کام حسب پروگرام ہی عمل میں آیا تھا۔ اس نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ مجرموں نے اس پر فائر کھول دیا۔ یہ رسکی کام تھا مگر انتقام میں وہ دیوانہ ہوگیا تھا سو یہ بھی کر گزرا ایک گولی بازو چیرتی ہوئی گزر گئی تو وہ آگے پیچھے جھولتا ہوا سڑک پر ڈھیر ہوگیا اور عائنہ حاکم چلاتی گئی۔

"عظمی بھائی! ہائے عظمی بھائی! ارے ظالمو! میرے بھائی کا کتنا خون بہہ رہا ہے۔ پلیز چھوڑو مجھے، میں تیار ہوں تمہارے ساتھ جانے کو مگر میرے بھائی کو طبی امداد تو دلوا دو۔"

مگر ایک نہ سنی گئی اور وہ ان جملوں میں چھپی محبت کو اپنے اندر اترتا دیکھ کر بھی گونگا بہرا بن گیا۔

"بعض اوقات یہ نفرت ہر جذبے پر حاوی کیوں ہو جاتی ہے؟ زندگی نے پوچھا مگر وہ واقعی خون زیادہ بہنے سے بے ہوش ہوگیا تھا پھر آنکھ کھلی تو وہ ہاسپٹل میں تھا اور بازو میں بے تحاشہ ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

"کیسے ہو بچے؟" بابا سائیں نے اتنی بے قراری اور محبت سے پوچھا کہ اس کی آنکھوں میں بے سبب آنسو آگئے مگر وہ انہیں پی گیا پھر بھرائے لہجے میں بولا۔

"میں، میں بالکل ٹھیک ہوں صاحب! لیکن عائنہ بی بی کا اغوا میری کارکردگی کے منہ پر طمانچہ ہے۔"

"نہیں نہیں بیٹا! تم نے کوشش تو کی تھی ناں، سب کہتے ہیں تم نے اغوا کرنے والوں سے بھرپور معرکہ لڑا مگر ریوالور کے آگے کوئی کب تک۔ جمارہ سلمٰی ہے۔ بے فکر رہو۔ اس وقت شہر کی ساری پولیس عائنہ کی بازیابی کے لیے مصروف عمل ہے۔"

"مگر صاحب! یہ فرض تو میرا تھا نا مگر میں اسے نبھا نہیں سکا۔ میں پٹھان ہو کر بس ایک گولی سے بے ہوش ہوگیا۔ تف ہے مجھ پر۔"

"یوں نہیں کہتے بیٹا! سب ٹھیک ہو جائے گا گھبراؤ نہیں ویسے بہتر سمجھو تو گھر شفٹ ہو جاتے ہیں۔ گولی نے صرف بازو کا گوشت پھاڑا ہے ہڈی محفوظ رہی ہے بالکل پریشان مت ہو۔" لمحہ بھر کو تھمے پھر بولے۔ "پھر کیا خیال ہے تمہارا بیٹے؟"

"وہی جو آپ بہتر سمجھیں میرے لیے، آپ کی رائے افضل ہے صاحب۔" تھوڑا رکا پھر پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولا۔ "خدا کی قسم صاحب! جب تک عائنہ بی بی کو بازیاب نہ کروایا تب تک مجھے چین نہیں آئے گا۔"

اور پھر ان کے مشورے کے مطابق وہ گھر آگیا ایک دو دن آرام کیا پھر اگلے اسٹیپ کے تحت معلومات کے لیے نکل کھڑا ہوا بابا سائیں منع کرتے رہ گئے مگر وہ مجرم پیشہ اور بری شہرت پر اتنا بھی اعتبار نہ کرتا تھا تبھی جب سے عائنہ اغوا کی گئی تھی اس کا ایک بہت قریبی

دوست حسن ان مجرموں کے درمیان عائنہ کا خود ساختہ محافظ بنا ہوا تھا۔ حسن کو اس نے اپنے خاص آدمی کے طور پر بھیجا تھا مگر حسن بھی میک اپ ہی میں تھا اور کالج کے زمانے کی اسٹیج کی سرگرمیاں اور اداکاری کا شوق اس کے بے حد کام آرہا تھا سو وہ حسن کی سلامتی اور عائنہ کے تحفظ کے لیے اس معاملے کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا پھر اس واقعہ کا پانچواں دن تھا جب پولیس نے رات کی خاموشی میں ریڈ کیا اطلاع حسن نے دی تھی عائنہ حاکم ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ باہر گولیوں کی دھائیں دھائیں ہو رہی تھی کہ ایک نقاب پوش اندر چلا آیا۔

"جلدی نکل چلو یہاں سے۔ وہ مجرم تمہیں بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔ تم نے کھسیانی بلی کے کھمبا نوچے کی مثل سنی ہے ناں تو چلو فوراً" میرے پیچھے چلی آؤ۔"

وہ اندھیروں کا سفر کرتا اسے روشنی میں لاکر غائب ہوگیا۔ وہ مین اسٹاپ پر کھڑی تھی اور با آسانی اپنے گھر جاسکتی تھی اس لیے اسے تھوڑی سی تسلی ہوئی اور اپنی روٹ بس میں بدقت سوار ہوگئی۔ ٹیکسی یا رکشے کا وہ اتنی رات گئے رسک نہیں لے سکتی تھی کہ دودھ سے جلی ہوئی تھی۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے جب وہ گھر میں داخل ہوئی۔ بابا سائیں نے کھینچ کر اسے سینے سے لگالیا اور ماما اس کے ملگجے کپڑوں، اس کے انداز سے آنے والے کسی عذاب لمحے کو دل پر دستک دیتے ہوئے محسوس کر رہی تھیں پھر پولیس پارٹی ناکام و نامراد لوٹ آئی تو انسپکٹر راحیل سے بات بھی نہ ہو پا رہی تھی۔

"آئی ایم ساری سائیں! ہم نے اتنی احتیاط کی لیکن پھر بھی پتا نہیں وہ عائنہ بی بی کو ادھر ادھر کرنے میں کیسے کامیاب ہوگئے۔"

"عائنہ وہ، وہ تو گھر آگئی ہے راحیل اظفر۔"

"جی۔ بی بی گھر آگئی ہیں؟ آپ نے پہلے بتانا تھا ناں۔ پلیز ان سے ملاقات ہو جاتی تو بہتر تھا۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا گروہ تھا جس کے فرنٹ سائیڈ پر ہم نے اٹیک کیا۔ وہ اگر کچھ معلومات بہم پہنچا دیں تو ہمارے لیے آسانیاں ہو جائیں گی اور مجرموں کی شناختی پریڈ بھی تو ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے سب ہو جائے گا۔ مجھے اس سے انکار نہیں مگر بچی ابھی لوٹی ہے۔ خوف زدہ ہے، تھکی ہوئی ہے۔ آپ کل آکر اپنی کارروائی مکمل کر لیجیے گا۔"

انسپکٹر راحیل اظفر سر ہلا کر آگے بڑھ گیا اور دوسرے دن وہ معاملات میں صرف ان مجرموں کو شناخت کرنے کے علاوہ کوئی اور کارگر بات نہ بیان کر سکی اپنی گلو خلاصی میں اس نے جو واقعہ بتایا اسے انسپکٹر کی ذہانت نے آسانی سے ہضم نہیں کیا، اس کی آنکھوں میں شکوے تھے، جیسے لڑکی کسی کی شخصیت کو پردے میں رکھنا چاہتی ہے مگر عائنہ حاکم کی آنکھوں میں اتنی سچائی تھی کہ وہ زیادہ رد و قدح کر ہی نہ سکا اور کارروائی مکمل کر کے اٹھ گیا اور خود عائنہ حاکم تھی کہ "عظمت اللہ" کی دیکھ ریکھ میں لگ گئی تھی، اتنی محبت ہے کہ کبھی ضمان حیدر کے اندر تبدیلی کسی منہ زور لہر کی طرح اس طرح بیدار ہوتی کہ اسے اپنے اوپر اختیار نہیں رہتا۔ مگر الٹ کھول کر ماں کی تصویر دیکھتا تو اس میں چھوٹے چھوٹے کئی الاؤ دہک جاتے۔

"ابھی تو کچھ نہیں کیا، ابھی تو سمندروں آنسو ہیں جو آنکھوں میں بھرنے ہیں، دکھ ہیں جو تمہارے نام کا حوالہ ہوں گے حاکم صاحب۔"

وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتا اور ایسے مشورے دیتا بابا سائیں کو جو بظاہر سود مند اور خوب صورت لگتے مگر ان کے لیے مزید پریشانیاں خریدنے کا سبب بنتے اور ایسے میں وہ بڑھ کر بڑے دھڑلے سے اپنی غلطی مان لیتا مگر بابا سائیں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیتے۔

"یوں مت سوچا کرو بچے! فیصلے درست اور غلط اس قدر ہماری زندگیوں پر اثر انداز نہیں ہوتے جتنا ہماری قسمت اثر انداز ہوتی ہے۔ تم نے جینئس افراد کو تاریکی میں ڈوبتے اور کسی گمنام کو شہرت کی بلندی پر پہنچتے نہیں دیکھا ہوگا، مگر میں گواہ ہوں ایسے کئی لمحوں کا۔ سو بھول جاؤ جو فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہوا اسے ہمارے لیے اسی حالت میں تخلیق کیا گیا تھا۔ یہی زندگی کا چکر ہے کیا سمجھے۔"

وہ خاموشی اختیار کرلیتا۔ زیرلب آئی مسکراہٹ دبا لیتا اور جب اپنی انیکسی میں لوٹتا تو حیران ہو ہو جاتا۔ کمرہ ہروقت لشکارے مار رہا ہوتا اور تازہ گلاب محبتوں کے موسم کی طرح اردگرد ہلکورے لیتے رہتے مگر ہرجذبہ ٹکرا کر اس میں سیندھ لگائے بغیر آگے بڑھ جاتا اور وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر اپنی مضبوطی پر خود ہی کو داد دیا کرتا مگر تھکن نجانے کیوں وجود میں چنگاری کی طرح تیرتی پھرتی۔ کسی پرکھارت کی آرزو کرتی، کسی نخلستان کی دعا مانگتی اور نظر پتہ نہیں کیوں عاصمہ بی کے اردگرد بٹ جاتی۔ ایسے کہ ماں کی یاد دل پر اور گہرا اثر چھوڑتی چلی جاتی اور اس کا بھی من کرتا کہ وہ بھی امینہ اور عائنہ حاکم کی طرح ان کے گلے سے جھول کر فرمائش کرتا ان کی گود میں سر رکھے اپنی تھکن اتارتا مگر وہ یہاں محبتیں شیئر کرنے ہی کب آیا تھا جو واقعی اس راہ لگتا۔ نفرتیں جو دل میں لمحے سینت سینت کر رکھی تھیں وہ نفرتیں ان میں انڈیلنے آیا تھا اور آج کل جھنجلا اس لیے بھی گیا تھا کہ سلمان نے اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا پہلے تو اس نے یہی سمجھا یہ عام سی ناراضگی ہے مگر جب بات کرنے کو ترس گیا نہیں وہ عام باتیں تو ہر کسی سے کر سکتا تھا بلکہ ٹائم پاسنگ والی کئی دوستیاں اس نے یہاں مختصر قیام کے دوران ہی بنالی تھیں مگر خاص اور دل کی باتیں تو کسی ایک اور خاص ترین بندے ہی سے کی جا سکتی تھیں اور بس یہی کمزوری تھی اس جیسے مضبوط بندے کی کہ سلمان حیدر اس کا خاص ترین تھا زیادہ دن برداشت نہ کر سکا تو اس نے فلیٹ پر دھاوا بول دیا۔ سلمان حیدر ٹھس بیٹھا رہا ایک لفظ نہیں بولا اور ضمان حیدر جاں کنی سے اسے تکتا چلا گیا۔ اس نے پھر بھی توجہ نہ دی تو چلا اٹھا۔

"تمہیں معلوم ہے تمہاری ناراضگی میری ذات کا سب سے بڑا ویک پوائنٹ ہے اس لیے ہی تم مجھے کچوکے دے رہے ہو؟" اس نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔

"بابا کہا کرتے تھے صرف دو انسان زیادہ چلایا کرتے ہیں، ایک وہ جنہیں علم ہو کہ جو وہ کہہ رہے ہیں۔ وہ حقیقت نہیں سو وہ بات میں دم پیدا کرنے کے لیے شور کرتے ہیں اور ایک وہ جن کے اندر باہر سے زیادہ شور ہو اور وہ اندر کی نفی کرنے کے لیے لاؤڈ ہوتے ہیں اور تم! مجھے تم دوسرے شخص لگتے ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔" سلمان نے کوئی رد عمل نہیں دیا اور کتاب اٹھالی اور جیسے کتاب سے مخاطب ہوا۔ "ہمیں یا تو سچ مان لینا چاہیے یا جھوٹ بولنا اتنی مہارت سے آنا چاہیے کہ ہم سچ کو اتنی ہی فورس سے جھٹلا سکیں۔"

"تم ان ڈائریکٹ کیوں بول رہے ہو، ڈائریکٹ بات کیوں نہیں کرتے مجھ سے؟"

اس نے ماما بابا کی تصویر پر نظریں اور ٹکادیں آہستگی سے بولا۔ "جنہیں ہم اہم سمجھتے ہیں کوشش کرتے ہیں ان کو کانٹا چبھنے کی بھی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑے مگر اس کو کیا کہیں گے اگر کوئی شخص اپنے ہاتھوں سے اپنی راہ میں خار بچھائے اور ٹوٹے ہوئے کانچ پر چلنے کی سعی کرے کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔۔؟"

ضمان تھک کر صوفے پر گر سا گیا اور سلمان حیدر بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا پھر فضاؤں کو مخاطب کرکے بولا۔

"میں نے بہت چاہا۔ میں تمہیں روک لوں مگر تم نہیں رکے اس خار خار راستے پر چلنے سے پھر اب کیوں آئے ہو میرے پاس زخم دریدہ ٹوٹے ہوئے؟" مڑ کر اسے دیکھا پھر پوری سچائی سے بولا۔

"دل کے موسموں سے بغاوت کرنے والے زیادہ دیر پیروں پر نہیں چلا کرتے ضمان! ایسے لوگ بہت جلد زندگی کے صحرا میں بے دم ہو کر گر جایا کرتے ہیں اور کوئی نہیں ہوتا جو ان کے پیاسے حلق میں محبت کی چھاگل سے رس ٹپکائے۔ محبت دوا نہیں مگر پھر بھی محبت دل میں کسی جوہڑ کی طرح ٹھہری رہے۔ جمی رہے تو کائی بن جاتی ہے پھر اس کا ہر قطرہ سم بن جاتا ہے مگر افسوس تم نے یہ سچائی تسلیم کرکے ٹھکرا دی۔"

ضمان حیدر اسے دیکھتا رہا پھر جوشیلے انداز میں اٹھا اسے دونوں کاندھوں سے تھام لیا اور چلایا۔

"صرف میرا قصور ہے اس سارے معاملے میں؟ کیا صرف میرے جرم، میری خطائیں ہیں مانی! بولو! کیا

واقعی میں ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ثابت کر رہا ہوں؟"

سلمان حیدر اسے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر کھڑکی سے ٹیک لگا کر دھیرے سے بولا۔

"جرم کسی کا بھی ہو ضمان حیدر! مجرم، خطاکار تم بھی ہو۔ تمہیں کیا پتہ بھائی کا لفظ محض لفظ نہیں، امید، تمنا اور خواہش ناتمام کا ایک تسلسل ہوتا ہے۔ دعائے نیم شبی کی قبولیت کا سا مزا رکھتا ہے۔ اس معاشرے میں عورت کے لیے تحفظ کا ایک ناقابل تسخیر قلعہ ہوتا ہے۔ لڑکیاں جس قدر بھی بہادر بن جائیں، کتنی ہی خود مختار ہوں مگر انہیں بھائی، بیٹے، باپ اور شوہر کے نام کی اس ناقابل تسخیر فصیل کی ضرورت ہوتی ہے مگر تم نے، تم نے بھی یہ مان توڑ دیا۔ تم جو ان کی روح سے تشنگی کے کانٹے چن سکتے تھے تم نے ان کی روح کو کانٹوں میں کھینچ لیا۔ لہولہان کر دیا، محض ان کے باپ کی کسی غلطی کی سزا میں۔ تم نے کبھی سوچا ہے ضمان! وہ لڑکی جو چار پانچ دن بعد بازیاب کرائی گئی ہے۔ اس کے متعلق اخبارات نے کیا کیا لکھا اور اس کے لیے لوگ کیا کیا کہتے ہیں۔ اسے کالج سے مائیگریٹ کرنا پڑا ہے مگر یہ طعنے ساری زندگی اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ ساری زندگی خوشی کو پورٹرے نہیں کر سکے گی۔ وہ میری کچھ نہ سہی پر تمہاری تو بہن تھی مگر تم نے، تم نے کیا کیا اس کے ساتھ۔ اسے دنیا کے سامنے ایک اذیت بنا دیا ہے۔ تم پھول کھلا سکتے تھے گلاب مگر ضمان! تم نے ببول اگا دیے ہیں اور وہ پھر بھی تمہیں اپنا بھائی اور جانے کیا کیا تسلیم کرتی ہے۔ بہنیں بہت کمزور، بڑی پیاری سی عنایت ہوا کرتی ہیں ضمان! لیکن تم نے خود تو اس نعمت کا کفران کیا۔ مجھ سے بھی اس دھوپ دھوپ زندگی میں موجود سایہ چھین لیا۔ تم نے اپنا نہیں میرا بھی نقصان کیا ہے ضمان! پھر بھی کہتے ہو میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ کیا واقعی مجھے احتجاج کا بھی حق نہیں۔؟"

کہتے کہتے اس کی آواز روہانسی ہو گئی اور وہ اسے دیکھے گیا۔ جواب ایک بات کا بھی نہ تھا۔ سو فلیٹ سے نکلتا چلا گیا، پھر بابا سائیں کا بھتیجا تھا جس نے اس حادثے کے چھ ماہ بعد بابا سائیں کے سامنے عائنہ حاکم کے لیے اپنا انتخاب لا رکھا۔

"یہ شخص کون ہے صاحب؟" اس نے مشورہ لینے پر آمادہ حاکم صاحب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور وہ تفکر سے بولے۔

"میرا بھتیجا ہے، مگر عظمی! میں نے اس کے متعلق کچھ زیادہ اچھی خبریں نہیں سن رکھیں۔"

"پھر کیا ارادہ ہے آپ کا اس بابت؟"

"پتہ نہیں۔ میری تو عقل ٹھپ ہو گئی ہے بچے! اس کی شخصیت کی کجی کو دیکھتا ہوں تو دل نہیں چاہتا مگر عائنہ کے اغوا کے بعد کی صورت حال دیکھتا ہوں اور آئندہ کا منظر نامہ تخلیق کرتا ہوں تو یہ انتخاب زیادہ بہتر لگتا ہے۔ گھر کا لڑکا ہے۔ خاندان کی عزت کو عزت سمجھے گا۔ ایک بار دھوپ میں ڈالے گا تو ایک بار چھاؤں میں بھی رکھے گا۔"

"یعنی آپ فیصلہ کر چکے ہیں، پھر آپ مجھ سے کیا مشورہ چاہتے ہیں؟"

"پتا نہیں، میں کوئی فیصلہ کر چکا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں، یا اس بات کا خواہاں ہوں کہ تم مجھے اس فیصلے سے سختی سے منع کر دو۔ سچ پوچھو تو بچے! اس لمحے واقعی مجھے ایک بیٹے کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اگر میرا کوئی دست راست ہوتا تو شاید یہ دردناک واقعہ ہوتا ہی نہیں اب بہنوں کا کوئی ایک بھائی بھی ہوتا ناں تو میں سکون سے آنکھیں بند کر سکتا کوئی ہوتا جو ان کا تحفظ بن جاتا۔"

"مطلب آپ بیٹیوں کے مقابلے میں بیٹوں کو ترجیح دینے والے ہیں۔" بابا سائیں نے نظر اٹھا کر دیکھا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"یہ سچ ہے عظمی! میں اس سے منکر نہیں ہو سکتا، نہ یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے عظمت کے سنگھاسن پر بٹھا کر پوچھو اور سمجھو میں انسان کے روپ میں فرشتہ تھا۔ فرشتے دنیا میں کہیں نہیں ہوتے کیونکہ ہم سب انسان ہیں عام سے، کمزور سے انسان۔ اور میں، میں ان عام انسانوں میں سے زیادہ عام انسان تھا۔ میری نظر میں زندگی محض لذت کام و دہن اور وجود سے آگے کچھ تھی نہ اس کے بعد کچھ۔ میں نے زندگی کو جی بھر

کرانجوائے کیا تھا کہ اچانک مری زندگی میں عاصمہ داخل ہو گئی، خوشبو کی طرح پر تاثر اور سبک عاصمہ۔ میں نے زندگی کے اصل لمحے ان دنوں گزارے، میں جیا بھی ان ہی دنوں تھا مگر یکے بعد دیگرے بیٹیوں کی آمد نے مجھے اس سے متنفر کر دیا لیکن اب سوچتا ہوں تو یہ سب میرے دل کی ایک موہوم برائی کی ہلکی سی رمق تھی جس نے عاصمہ کا اور مری بچیوں کا چہرہ کملا دیا۔ عظمی! یہ سچ صرف میں تم سے شیئر کر رہا ہوں کہ اگر عاصمہ صرف بیٹیاں مرے ذمہ نہ لگاتیں میں تب بھی اتنا ہی برا ہوتا۔ برائی مرے ڈی این اے میں شامل تھی کیونکہ ہمارے خون کا یہی تو خاصا تھا زور ہو، طاقت ہو حکمرانی ہو، تو کون کافر ہو گا جو اپنے دماغ میں رہے گا۔ بس یہی اختیار اور طاقت کا کھیل تھا جو میں نے سدا کھیلا۔ کتنے چہرے میری زندگی میں آئے مگر کوئی بھی ان میں سے نہ مجھے بیٹا دے سکا نہ مجھے باندھ سکا۔ عاصمہ کو بھی محض اس لیے میں نے طلاق نہیں دی تھی کہ شاید مجھے لگتا تھا عاصمہ نے مجھے محبت کی مدھ چکھائی تھی۔ پتہ نہیں میں جن دنوں محبت کو خرافات اور خلل دماغی گردانتا تھا تب بھی میں نے محبت پر جب بھی سوچا عاصمہ ہی میری سوچ کے کینوس پر پھیلتی چلی گئی۔ دل کے کہیں اندر اسپارکنگ کرتی ہوئی، نہیں معلوم اس سے اس انسیت، محبت کی وجہ یہ تھی کہ وہ میری پانچ بیٹیوں کی ماں تھی یا شاید یہ کہ زندگی کے اولین دنوں میں، میں نے جس چہرے کو غور سے دیکھا اور صنفی کشش سے ہٹ کر کچھ بہت اچھے جذبے اس کے نام کیے وہ عاصمہ تھی۔ اور مرد ہو یا عورت پہلی محبت، پہلی توجہ بھری نظر کبھی نہیں بھولتا سو میں بھی اس نظر سے بندھا یہاں چلا آیا۔ میں سرتاپا بدل گیا ہوں، بدل گیا تھا عظمی! بیٹے، بیٹی کا تقابل اور خواہش بھی کہیں اندر جا سوئی تھی مگر اس نے سیٹ اپ میں میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی واقعی ہوتا میرا دست و بازو بننے والا انہیں تحفظ دینے والا ان کا ماں جایا کوئی ہوتا۔"

وہ خاموش ہو گئے تو اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ پتہ نہیں ان آنکھوں میں آج پھر سے سرخی کیوں دوڑ گئی تھی۔ وہ جو سلمان کی باتوں سے پگھل گیا تھا، پھر سے اس بات پر کیوں چٹان ہو گیا تھا کہ اس داستان میں اس کی ماں کا تذکرہ تو ایکس وائی زیڈ کی حیثیت سے بھی نہ کیا تھا حاکم صاحب نے اور ایک اس کی ماں تھی کہ حیدر کے نام کی چادر اوڑھ کر بھی کبھی کبھی خاموشی سے اس سنگ دل انسان کے لیے رویا کرتی تھی شاید ان کی بھی یہی مجبوری تھی کہ اس شخص کا چہرہ ان کی زندگی کا اولین چہرہ اور محبت کا پہلا احساس لیے ہوئے تھا۔"

وہ سر جھکائے سوچے جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ اچانک بابا سائیں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"بولو بھی عظمی! تمہاری صائب رائے کیا ہے، تمام حالات تمہارے سامنے ہیں۔" اس کا دل چاہا کہے۔

"عائنہ اب اتنی بھی ارزاں نہیں کہ "ہاشم نصیر" کو اس کی زندگی اور قسمت کا مالک بنا دیا جائے جو جرم اس کا تھا نہیں اس کی سزا بھی اسے کیوں ملے دنیا میں ہر شخص کے لیے اس کا دوسرا گمشدہ حصہ بھی تخلیق کیا گیا ہے۔ سب کے جوڑے بنائے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عائنہ حاکم کی زندگی کا اصل ہم سفر اس کی حاجت لیے اس کے در پر دستک نہ دے۔ یہ انتظار جاں گسل ضرور تھا مگر ناممکنات میں سے نہیں تھا۔ انتظار شرط تھی اور عائنہ حاکم جیسی پیاری لڑکی کے لیے انتظار ہی بہتر تھا۔ کبھی نہ کبھی تو زندگی مہربان ہوتی۔"

وہ بڑھ کر یہ بھی کہنا چاہتا تھا۔

"بابا سائیں ادھر دیکھیے میری طرف میں آپ کے عمل کے ردعمل میں کس قدر برا بن گیا ہوں کہ اب خود کو نہیں پہچان سکتا مگر دیکھیے آپ کی طرح اب تک میں بھی نیک نام ہوں۔ ملنے جلنے والوں، دوستوں میں کولیگز میں معتبر اور با اعتبار ہوں اور ایک وہ معصوم لڑکی ہے، وہ کتنی بے اعتبار اور کتنی ارزاں کر دی گئی ہے۔ مجرم ہم دونوں ہیں سزا صرف اسے تنہا ملے گی؟ ہم دونوں کو پھانسی ملنی چاہیے۔ قتل وجود کا، ہو ذات کا ہو، قتل تو قتل ہوتا ہے ناں۔"

مگر وہ یہ سب سوچ کر بولا تو دل کے برخلاف اچانک

ہی ماں کی آنکھیں اس کے دل پر آنسو ٹپ ٹپ کر کے برسانے لگی تھیں۔ وہ آنسو تھے کہ چنگاری۔ جہاں قطرہ ٹپکتا وہیں دل کی سرزمین پر ایک داغ پڑ جاتا دھواں اٹھنے لگتا اور اسی دھوئیں میں اس معصوم لڑکی کا چہرہ فیڈ آؤٹ ہو گیا اور وہ مدھم انداز میں بولا۔

"ٹھیک کہتے ہیں صاحب! آپ کا فیصلہ راست فیصلہ ہے اس سچویشن میں اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔"

بابا سائیں نے تھکے تھکے انداز میں اسے دیکھا جیسے مان لینے کا جو ارادہ باندھا تھا دل نے، اس سے ہٹ کر دیئے جانے والے مشورے نے انہیں دھچکا پہنچایا تھا مگر یہی حالات کے پیش نظر بہتر تھا سو انہوں نے حامی بھر دی۔

ماموں نے سنا تو تڑپ کر رہ گئے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں بھائی صاحب! عاصمہ! تم انہیں سمجھاؤ۔ اس فیصلے سے انہیں روکو، یہ سب ہونے سے کہ تم سے زیادہ بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ روح کی درماندگی اور ناپسند زندگی گزارنے کی اذیت اپنی محبت کے بدلے نفرتیں پانے کی ذہنی اذیت۔ عاصمہ! سمجھاؤ انہیں۔" کہتے کہتے رکے پھر آہ بھر کر بولے۔

"کاش اس وقت میرا کوئی بیٹا ہوتا تو عائنہ بیٹا کے لیے میں سینہ سپر ہو جاتا، لڑ جاتا اس کی خوشیوں کے لیے مگر وائے افسوس"

دکھ یہاں سے وہاں لہجے کی طرح آنکھوں میں بھی در آیا۔ عاصمہ حاکم نے بھائی کی باتوں اور اپنی طویل ازدواجی زندگی کی خزاں رسیدہ شاموں سے جو اذیت کشید کی اس کا حساب کتاب لگایا تو برملا حاکم صاحب کے سامنے ڈٹ گئیں مگر ان کی ایک نہ چلی فیصلہ وہی ہوا جو بابا سائیں نے کیا اور امینہ جو تھی اس کو جھنجھوڑ کے بار بار یہی کہتی تھی۔

"تم لڑو عائنہ! اپنے حق کے لیے لڑو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے، کہاں کا انصاف۔"

اور عائنہ حاکم ہتھیلی آگے پھیلائے اس سوال پر گم صم رہ جاتی۔ انصاف تو سدا سے یہی رہا ہے۔ لڑکیوں کے نصیب تو چھدری چادر ہیں کہ دھوپ چھن چھن آتی ہے۔ پیوند لگائے، تب بھی کوئی نہیں جوان کی ذات کے کاسے میں اعتبار، بھرم اور مان کے سکے اچھالے۔ وہ ساری زندگی یونہی کسی دست رہتی ہیں، خالی ہتھیلی کی طرح خالی خالی، تن من دونوں سے مسافتیں سمیٹ کر کسی جاہ، کسی منزل پر پہنچ جائیں تب بھی انہیں اپنے لیے کوئی لمحۂ قرار، لمحۂ معتبر نہیں ملا کرتا۔ سامنے دھول اڑاتا راستہ ہوتا ہے اور پیچھے زخم زخم راستے کی یادیں اور ساتھ ہوتا ہے دریدہ و درماندہ لہولہو جود۔

"تم چپ کیوں ہو عائنہ! تم پڑھی لکھی ہو، بابا کے سامنے جاؤ اور لڑ کر کہو تمہیں یہ فیصلہ منظور نہیں۔ جس جرم میں تمہارا قصور نہیں اس کی سزا بھی تمہیں کیوں ملے تم۔۔۔ تم ہاشم نصیر جیسے بے سمت اور بے مہر انسان کے لیے نہیں بنی ہو، تمہارے لیے تو کوئی بہت پیارا انسان آئے گا۔ ہاں عائنہ! سچ کوئی بہت پیارا انسان، جس کے پاس تمہارا پتہ ہو گا اور تمہاری طلب مگر جسے ابھی تک تمہارے گھر کا راستہ نہیں ملا ہو گا مگر وہ محو سفر ہے اب بھی، ایک تمہاری آس کو دل میں بسائے تمہاری طلب میں محو سفر یائی گاڈ۔" وہ اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ موڑ کر اسے یقین دلاتی رہتی لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ کالج جانا چھوٹ چکا تھا۔ وجہ بابا سائیں نہیں تھے۔ وہ شہرتیں تھیں جو اخبارات کے ذریعے سارے کالج میں منہ میں انگلی ڈالے ہر وقت اس پر کف افسوس ملتی رہتیں اور تذلیل کے نئے نئے انداز سے اس پر زہر افشانی کرتیں۔ اب اس کی زندگی صرف گھر، کچن یا گارڈن تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کتابیں اور آگے پڑھنے کا عزم اس نے الماری کے سب سے نچلے خانے میں مقفل کر دیا تھا اور چابی لاپروائی سے گم کر دی تھی اور گھنٹوں سوچا تھا کہ کاش اذیت انگیز یادوں کو بھی ایسے ہی کہیں مقفل کر کے چابی گم کر دینا آسان ہوتا تو زندگی کتنی سہل ہوتی مگر یہ طے تھا اسے یہی مشکل زندگی گزارنی تھی۔ سو اس نے خود کو اس زندگی کے لیے ریزہ ریزہ کر کے پھر سے جوڑ لیا۔

بابا سائیں نے منگنی کی رسم کی تاریخ دے دی تھی اور امینہ بھرے دل سے اس کے لیے شاپنگ کر رہی تھی بقول بابا کے منگنی ہی سہی حاکم صاحب کی پہلی اولاد کی خوشی تھی اور وہ اپنے سب ارمان نکالنا چاہتے تھے۔ یہ اور بات کہ سارے گھر میں ماتمی فضا طاری تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے منگنی کا دن بھی آگیا۔ عائنہ حاکم سفید کامدار شرارہ سوٹ میں اداس کہانیوں کا اداس روپ بنی بیٹھی تھی اور ستون کے پیچھے کھڑے ضمان حیدر کا دل یکدم ہی اس کے ملیح و پُرملال حسن پر اندر ہی اندر تھرانے لگا تھا۔ ایک بوجھ سا تھا جو دل پر آ گرا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا اور کھڑی ماں کہیں قریب ہی اس کی سوچ پر کف افسوس مل رہی تھیں۔

"میری محبت میں میری ہی صنف پر قہربانی کیوں؟ یہ میری نہ سہی پر ہے تو تیری بہن اور بہنوں کے قدموں اور راستوں میں آنے والے خار تو بھائی پلکوں سے چنا کرتے ہیں مگر ضمان! تو نے یہ کیا کیا؟ کیوں کیا ؟؟"

دل گھبرانے لگا تو وہ باہر آگیا۔ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ دل ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ عین اسی وقت لینڈ کروزر پورچ میں رکی۔ تین چار باڈی گارڈ اور دو دو ستوں کے ساتھ ہاشم نصیر اتر رہا تھا۔ لمبا چوڑا ہاشم نصیر جس کے چہرے پر سختی، درشتی اور کردار کی خامی خود بخود منعکس ہو رہی تھی چہرہ واقعی دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ مگر وہ عائنہ حاکم اس کا کیا قصور تھا چھوٹی سی معصوم سی عائنہ حاکم کا کیا ہو گا' وہ اس شخص کے لیے تو نہیں بنی اس کے لیے تو کوئی بہت پیارا انسان ہونا چاہیے کوئی بہت ہی پیارا انسان۔"

وہ واپس پلٹا مگر رسم کا اعلان ہاشم نصیر کے بیٹھتے ہی ہو چکا تھا۔ وہ ستون پر بے ساختہ مکا مارتا رہ گیا اور عائنہ حاکم تھی کہ سراپا حسرت بنی اس کو تک رہی تھی۔

"تم میرے محافظ تھے' میرے بھائی تھے مگر تم نے ہی مجھے دار چڑھا دیا۔"

"نہیں' یہ کیسے ممکن ہے۔ اس سے کس نے کہا میں اس کا بھائی ہوں؟ اسے کیونکر علم ہو سکتا ہے کہ اس کا میرا خون کا رشتہ ہے ؟؟"

پشت موڑ کر سوچا مگر وہ سوال' وہ شکوہ کیا تھا جو اس کی پلکوں میں آ اٹکا تھا۔

"عائنہ حاکم! میں کتنا برا ہوں ناں۔"

مڑ کے اس نے دیکھا مگر عائنہ حاکم کا سر جھکا ہوا تھا' شاید یہ سر اب ہمیشہ ایسے ہی جھکا رہے گا۔ لوگ تو محبت میں کبھی کبھی خدا ہوتے ہیں مگر یہ شخص جو اس کے برابر بٹھا دیا گیا' ایک اس کی انتقامی کارروائی کے تاوان میں' یہ شخص تو سرتا پیر فرعون ہے۔ تو کیا عائنہ حاکم کا سر کبھی سجدے سے اٹھے گا ہی نہیں۔ رو پہلی زنجیریں اس کے پیروں میں' ہاتھوں میں اور روح کے گرد حصار ہو چکی تھیں اور یہ سب کچھ بہت دیر تک دیکھنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ سو وہ گھر سے باہر نکل آیا۔ سگریٹ پیتا' پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر منڑگشتی کرتا تھک گیا تو رکشہ کر کے واپس فلیٹ لوٹ آیا۔ سلمان حیدر نے دروازہ کھولا مگر توجہ تک نہیں دی۔ آہستگی سے ایک طرف ہو گیا۔ وہ اندر چلا آیا۔ سارا فلیٹ اسی طرح قرینے سے تھا بس ایک اس کی زندگی بے قرینہ ہو گئی تھی۔

"کیسے ہو تم؟۔" اجنبی بن کر کسی اپنے سے ملنا جس قدر بھی اذیت انگیز سہی مگر کم اذیت انگیز یہ بھی نہیں کہ جب کوئی اپنا اجنبی بن کر بھی آپ کو جواب دینا ضروری نہ سمجھے' کتنے لمحے تک دل سنبھالتا ہے تا آپ کی حساسیت۔ سو وہ بھی بت بنا کتنی دیر تک سلمان حیدر کو تکتا رہا پھر ڈھیٹ بن کر آگے بڑھا اور اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

"ناراض ہو ابھی تک؟" سلمان حیدر نے پھر کچھ نہ کہا۔ واپس بیڈ پر آ بیٹھا۔ ضمان حیدر کی روح آنکھوں میں کھنچ آئی! ایک طرف عائنہ حاکم ناراض کھڑی تھی اور ایک طرف یہ شخص روٹھا بیٹھا تھا جو دنیا میں اسے بہت عزیز تھا۔

"سلمان! او مانی! ادھر دیکھ کیا واقعی ناراض ہے ؟؟"

"نہیں' بہت عرصہ ہوا' یہ درد سر میں نے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ ہر شخص یہاں اپنے اصولوں' ضابطوں پر جیتا ہے پھر میں کون ہوتا ہوں جو تم سے

تمہاری زندگی پر سوال جواب کروں۔"

"بکو مت۔ ایک تم ہی تو ہو میرے اپنے۔"

"ہاں' یہ خوش فہمی تھی کبھی مگر اب یہ بھی نہیں۔ تمہارا کیا ہے ضمان حیدر! خدا جانے تم کب بدل جاؤ۔ کب تمہیں اپنی محبت حماقت لگنے لگے اور تم میرے لیے بھی ایسے ہی خار بھرے راستے تجویز کر دو جس پر مجھے برہنہ پا چلنا پڑے۔ تمہاری دشمنی قبول کی جا سکتی ہے مگر تمہاری دوستی نو ضمان حیدر! نو۔"

اس نے کمبل اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا اور روکھے لہجے میں بولا تو وہ بیڈ پر اس کے قریب چلا آیا پھر چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے بولا۔

"ادھر دیکھو' کیا واقعی میں اتنا برا ہوں ؟؟"

"آئی ایم ساری' میں نے عرصہ ہوا اچھے برے ہونے کا پیمانہ توڑ ڈالا ہے ڈیر! میں اب کسی کو اس کسوٹی پر نہیں پرکھتا کیونکہ یہ دنیا جادو کا کھلونا ہے یہاں ہر اچھا شخص برا بھی ہو سکتا ہے اور برا شخص اندر سے اچھا بھی نکل سکتا ہے اور مجھے! مجھے ماسک پر سے ماسک اتارنے کا فن نہیں آتا۔"

"طنز کر رہے ہو؟ کیا واقعی میں اتنا برا ہو گیا ہوں مانی؟۔" وہ رونکھا ہو گیا۔

مگر سلمان نے پھر ایک لفظ نہیں کہا اور وہ پھر سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ دل چاہ رہا تھا وہ ہاتھ تھام کے روک لے مگر اس نے بڑھ کر دروازہ اس کے احتیاج سے پہلے ہی کھول ڈالا تو دل زلزلے کی زد میں آ گیا۔ اسے محسوس ہوا وہ اس فلیٹ سے ہی نہیں اس کے دل سے بھی نکلتا چلا گیا ہے ہمیشہ کے لیے اور اب اسے یونہی خاک بسر در بدر پھرنا تھا بے خانماں برباد سا۔ اس نے بند ہونے والے فلیٹ سمیت دل کے دروازے پر حسرت سے نظر ڈالی' آنکھوں میں آجانے والے آنسوؤں کو اندر ہی اندر دھکیلا اور واپس کوٹھی لوٹ آیا۔ اور بابا سائیں تھے کہ اس سے پوچھ رہے تھے' وہ کہاں چلا گیا تھا۔

"میں یہیں تھا صاحب! بس کچھ طبیعت میں گرانی سی تھی اس لیے باہر چہل قدمی کے لیے نکل گیا تھا۔"

بابا سائیں مطمئن ہو گئے تھے اور وہ ملازمین کے سر پر کھڑا گارڈن کی آرائشی اشیاء گاڑی پر لوڈ کروا رہا تھا کام سے نمٹا تو اینکسی کی طرف جاتے ہوئے بے سبب اس کے قدم عائنہ حاکم کے کمرے کی طرف بڑھتے چلے گئے ہلکی ہلکی مدھم روشنی باہر جھانک رہی تھی اس نے ہولے سے دروازہ کھولا مگر وہ متوجہ نہیں ہوئی۔ لمبے بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور ارد گرد گجروں کے سرخ پھول پتی پتی بکھرے پڑے تھے۔ اسے لگا جیسے دل ریزہ ریزہ کے ٹکڑے ہوں اور وہ مگن تھی کینوس پر رنگوں سے لکیریں کھینچنے میں دل چاہا پکارے "عائنہ حاکم ادھر دیکھو۔ کیا تمہیں لگتا ہے تمہارے اس بھائی کے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں اندھے کنوئیں میں دھکیل سکتا ہے۔"

مگر نظر واپس اپنی طرف لوٹی تو آواز اندر ہی کہیں کھو سی گئی کہ اس کے ہوتے ہوئے کیا خود اس نے عائنہ حاکم کو اندھے کنویں کی صدا بنا دیا تھا جس کی تھاہ تھی نہ منزل' وہ الٹے پیروں واپس لوٹ آیا۔ بستر پر لیٹا تو ساری رات خود سے لڑتا رہا سو صبح جاگا تو شکست خوردہ سا وجود لیے ہوئے تھا بستر سے ہلنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ ہر چیز بری لگ رہی تھی جب ہی ایک ملازم اسے اٹھانے چلا آیا۔

"صاحب! بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔ بچیوں کو اسکول نہیں لے کر جانا کیا؟" سوال بھی داغ دیا تو اس نے بند آنکھیں بدقت کھولیں۔

"میری طبیعت کہتے کہتے یکدم رک گیا۔ "چلو میں آتا ہوں۔" پھر اس کے جاتے ہی منہ ہاتھ دھو کر بخار میں پھنکتا ہوا وجود لیے پورچ میں جا کھڑا ہوا۔

ثمرو نے دیکھا تو بڑے دلار سے سلام جھاڑا۔

"السلام علیکم عظمی بھائی۔" اور وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ ننھی عائنہ حاکم اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے محبت پاش نظروں سے اسے تکتے ہوئے۔

"کیا دیکھ رہے ہیں عظمی بھائی ؟؟" دھیرے سے پوچھا تو وہ مسکرانے لگا بے سبب اور دل تھا کہ اندر روئے گیا تھا۔

"کتنے پیارے پیارے دل ٹوٹ گئے۔ تم نے کیا

کمایا ضمان حیدر! صرف بد دعائیں۔" اور ثمرہ اس کی خاموشی سے گھبرا کر اس کے قریب چلی آئی۔

"آر یو آل رائٹ عظمی بھائی۔" ہولے سے ہاتھ تھاما اور چیخ پڑی۔

"او مائی گاڈ۔ اتنا تیز بخار ہے آپ کو۔ آپ بستر سے کیوں اٹھے۔ آپ نے کوئی دوا لی عظمی بھائی؟"

اس نے تھک کر نفی میں سر ہلایا۔ سارے وجود میں سائیں سائیں تھی یا چیخیں تھیں جو گونجتی پھر رہی تھیں اسے بہت کم ہوش رہا تھا جب اس کی سماعت میں ثمرہ کی آوازیں پڑی تھیں۔ اس نے ذرا کی ذرا دیر میں ہاہا کار مچا کر سب کو ہی بلا لیا تھا اور سب سے زیادہ پریشان ہونے والوں میں عائنہ حاکم پیش پیش تھی۔

"ثمرہ ٹھیک کہتی ہے عظمی بھائی! اتنا زیادہ ٹمپریچر ہے آپ کو۔ چلیے میں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا لاؤں۔"

اور وہ اسے دیکھے گیا بری شہرتیں اس کے نام تھیں وہ پھر بھی نیکی کے لیے ہمہ وقت پر تولے رکھتی تھی۔

"نہیں! میں خود چلا جاؤں گا۔" وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور کسی حوالے سے اس تقدس بھرے رشتے کو رگیدے سو تیز قدموں سے نکلتا چلا گیا۔ عائنہ' بابا سائیں سب پکارتے رہے مگر وہ رکا نہیں پھر چیک اپ کے بعد وہ پھر سے واپس نہیں جانا چاہتا تھا مگر بدقت لوٹ آیا۔ عائنہ حاکم' آمینہ حاکم' عاصمہ بی' ثمرہ اور باقی سب لڑکیاں اس کے لیے محو انتظار کھڑی تھیں۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے عظمی۔" عاصمہ بی نے بڑھ کر تفکر سے کہا تو اس نے آواز نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔ معمولی ٹھنڈ ہو گئی ہے بیگم صاحبہ۔"

"یہ معمولی سی ٹھنڈ ہے عظمی بھائی؟ شکل دیکھیے کیسی زرد ہو رہی ہے۔" عائنہ حاکم نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے نسخہ لیا اور فوراً ملازم بھیج کر منگوایا اور یوں اس کی تیمارداری کا دور شروع ہو گیا۔ وہ سب کی توجہ کا مرکز تھا اور خود اسے اپنے آپ سے حد درجہ چڑ ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے جیسے اس کے اندر محبت کا دیپ روشن ہو رہا تھا ویسے ویسے اسے کیے گئے اپنے عمل سے وحشت ہو رہی تھی اس لیے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ٹھیک ہوتے ہی اپنے جرم کا اعتراف کر لے گا اور

ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جائے گا مگر ابھی وہ پوری طرح سے ٹھیک بھی نہ ہوا تھا کہ سلمان حیدر چلا آیا۔ اس کی جان آنکھوں میں کھنچ آئی پورٹیکو سے ہی اس نے تھام لیا۔

"پلیز مانی! میں خود سب کہہ دوں گا تم یہاں میری پوزیشن آکورڈ نہ کرو۔"

"کیا مطلب؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟ آپ ہیں کون؟"

"مانی ـــــ" حیرت کے شدید جھٹکے سے وہ ہل کر رہ گیا اور وہ ایک ناپسندیدہ سی نظر اس کے چہرے پر ڈالے اندر بڑھ گیا اس سے یہ سب ہضم نہ ہوا تو وہ ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ آیا اور دیکھ کر حیران رہ گیا وہ سب لڑکیاں پہلے سے کان لگائے کھڑی تھیں اسے آتا دیکھا تو سب پزل ہو گئیں۔

"اوہ عظمی بھائی آپ۔" سب سے پہلے عائنہ حاکم نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور فرار ہونے میں عافیت سمجھی پھر ایک کے بعد ایک وہ سب غائب ہو گئیں اور وہ ڈرائنگ روم میں بابا سائیں کو ایک ماضی کی داستان سنا رہا تھا۔ ایک طلاق نامے کی کاپی' برتھ سرٹیفکیٹ' البم سامنے دھرے تھے اور وہ کہہ رہا تھا وہ داستان جس میں بابا سائیں نے ایک رئیس زادے کا رول پلے کیا تھا۔ ایک لڑکی سے شادی کی تھی پھر ایک ماہ بعد آنکھوں میں حیرت بھر کر کہا تھا۔

"کون شوہر؟ کیسا شوہر؟ نکاح نامہ ہے تمہارے پاس؟ گواہ لاؤ۔"

اور وہ لڑکی روتی رہ گئی تھی۔ اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اعتبار میں بہت بے دھڑک لوٹی گئی تھی مگر ماں باپ اور وہ خود اتنی غریب تھی کہ اس امیرزادے سے ٹکر نہ لے سکی اور متوقع بدنامی کے ڈر سے ہجرت کر گئی یہاں تک کہ اس کی زندگی میں ایک دوسرا شخص آیا' بہت ایماندار پرمحبت ایسا کہ اس کے سارے دکھ چنتا چلا گیا اس شخص نے اس کے لیے قانونی جنگ لڑی اور حاکم سرور کو لکھ بھیجا کہ اگر تم اسے بیوی تسلیم نہیں کرتے تو اسے باندھے رکھنے کا فائدہ طلاق دے دو ورنہ خلع لینے میں تمہاری بدنامی ہو

گی۔ سچ حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں۔ اس لڑکی کی جتنی بدنامی ہونی تھی ہو گئی اور اگر مزید بھی ہوئی' اس سچ کو منظرِ عام پر لانے میں تو میں تب بھی اسے اپنا لوں گا' اس لیے کہ جو شخص صرف جیتنے کے لیے کھیلے اسے شکست دینا آسان نہیں۔ کیا سمجھے۔"

اور دوسری طرف سے خاموشی سے طلاق نامہ آ گیا۔ وہ لڑکی سمندروں روئی اس طلاق پر' خوشی سے۔ عورت کے لیے یہ تازیانہ سہی مگر اس کے لیے تو اس کی پاک دامنی کا سرٹیفکیٹ تھا' اس کے نفس اس کی صنف کے معتبر ہونے کی سند تھا سو اس نے اس طلاق نامے کو محفوظ کر لیا اور چند ماہ بعد ہی اس کی شادی اس شخص سے ہو گئی جو اس کے لیے جنگ لڑ سکتا تھا اس کے لیے سینہ سپر ہونا چاہتا ہی نہیں بلکہ ہو بھی گیا تھا۔ یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا تھا اس امیر زادے کو کہ جسے اس نے سب سے کم مدت اعتبار کے سنگھاسن پر بٹھایا تھا وہی اس کے لیے وارث تخلیق کرنے کا سبب بنائی گئی تھی۔ خواہش کی تکمیل کا سبب تھی پھر بہت ڈھونڈا اس نے مگر وہ لڑکی نہ مل سکی تھی اور اب برسوں بعد ایک نوجوان بیٹھا تھا پرانی داستان سناتا ہوا' زندگی کا نیا کردار بنا ہوا بابا سائیں یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے تاموں' ممانی' عاصمہ.جی محو حیرت تھے اور وہ کہہ رہا تھا۔

"پھر سائیں کیسے ناں۔ پسند آئی آپ کو؟"

"کہانی؟ تم آخر ہو کون؟" بابا سائیں کتنی دیر بعد قوتیں مجتمع کر کے بولے اور وہ ہنس پڑا۔

"یہ نہ پوچھیں کہ میں کون ہوں یہ پوچھیں کہ آپ کا وارث کون ہے؟ میرے خیال میں ثبوت ناکافی تو نہیں۔" وہ کہہ کر کھڑا ہو گیا تو بابا سائیں باہر تک اس کے پیچھے آئے۔ وہ رکا نہیں تو وہ تھک کر پلٹے ضمان حیدر ایک دم رک گیا۔ آنکھوں میں آئے آنسو وہ کسی طور نہ چھپا سکا اور بابا سائیں تھے ڈبڈبائی آنکھوں سے خارجی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے چارگی سے کہہ رہے تھے۔

"چلا گیا۔ عظمی چلا گیا وہ لڑکا' وہ جو میری ساری کج روی کا سبب تھا اگر اسے جانا ہی تھا تو وہ آیا کیوں تھا کیا مجھے انتظار کے جاں گسل احساس کا شکار کرنے مجھے علم نہیں تھا تو صبر تھا اب میں کیسے جیوں گا۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ انہیں سہارا دیتا بیڈ روم میں لے آیا پھر بابا سائیں اس غم کو لیے بستر کے ہی ہو کر رہ گئے۔ سلمان حیدر اکثر فون کرتا قہقہے لگاتا اور ضمان حیدر چیختا۔

"تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ کیوں؟"

اور وہ لاابالی پن سے کہتا۔ "میری مرضی، تمہیں اداکاری کا شوق ہے کیا مجھے نہیں ہو سکتا۔"

یہ ڈرامے بازی یونہی چل رہی تھی کہ اچانک وہ لمحہ آ گیا جب اسے بہت شدت سے ضمان حیدر ہونا تسلیم کرنا پڑا۔ ہاشم نصیر امینہ حاکم سے بدتہذیبی سے پیش آیا تھا۔ جب اچانک کسی کام سے اندر آتے ہوئے ضمان حیدر کے خون میں پارہ گردش کرنے لگا تھا گھر میں سوائے امینہ' غانیہ اور ثمو کے کوئی نہیں تھا۔ بابا سائیں صرف اپنے کمرے تک محدود تھے اور عاصمہ بی ابھی تھوڑی دیر پہلے حاکم صاحب کو سکون آور دوائی دے کر پڑوس میں میلاد میں گئی تھیں کہ یہ شخص اچانک چلا آیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" ترخ کر اس نے سخت ترشی سے پوچھا اور اس شخص نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے کان سے مکھی اڑائی ہو پھر خباثت سے ہنس کر بولا۔

"آجاؤ' تم بھی آجاؤ۔ یہ خانۂ بے تکلف ہے۔ ہم دوستوں کے دوست ہیں اور پھر مالِ مفت سامنے ہو تو۔"

"شٹ اپ۔" پوری قوت سے تھپڑ اس کے چہرے پر کسی میکانکی عمل کے تحت ہی اس نے مارا تھا ورنہ وہ تو خود کو یہ باور کرا چکا تھا کہ ان میں سے کسی کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں' وہ صرف گارڈ ہے اور بس لیکن خون کا جوش رشتوں کی زنجیریں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ توڑ دینے سے واقعی ٹوٹ نہیں جاتیں وہ خشمگیں نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور ضمان حیدر کی آنکھوں میں قہر بانی تھی۔

"تم نے' تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"تم کون ہو نہیں کوئی تھے' اسے یاد رکھو۔ آج کے بعد تم اس گھر کے لیے کچھ بھی نہیں ہو' یہ بھی مت بھولنا۔"

"بکواس مت کرو۔ تم کون ہوتے ہو فیصلہ صادر کرنے والے؟"

"میں' میں اس گھر کا محافظ ہوں اور حق رکھتا ہوں فیصلہ کرنے کا۔"

ہاشم نصیر نے کینہ توزی سے دیکھا پھر شر انگیزی سے بولا "ان کا محافظ تو میں بھی بن سکتا ہوں! وہ رکا پھر بولا "اپنے اطراف خوب صورتی کسے بری لگتی ہے' مسٹر عظمت! ہاں بس تجھے دار باتیں بنانے کا ہنر آنا چاہیے۔ خوب عیش ہیں تمہارے۔ ایک نہیں بلکہ۔"

"آگے ایک لفظ مت کہنا' یہ سب میری بہنوں کی طرح ہیں۔"

"ہاہا۔ بہنیں۔" تمسخر سے کچھ اس طرح ہنسا کہ ضمان حیدر کا دماغ کنٹرول میں ہی نہیں رہا۔ وہ لڑ پڑا۔ دونوں جنگلی بھینسوں کی طرح ایک دوسرے کو رگید رہے تھے جب اچانک عاصمہ.بی ہونق سی امینہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوئیں۔

"ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو؟"

"آپ! ہٹ جائیے بیگم صاحب! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ لڑتا رہا یہاں تک کہ عاصمہ.بی کو حاکم صاحب کو جگانا پڑا۔ انہیں حقیقت کا علم ہوا تو ان کے منہ سے کف نکلنے لگا۔

"ٹھیک کیا عظمی نے' ٹھیک کیا۔ اس کے ساتھ اس سے بھی برا ہونا چاہیے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ شکل مت دکھانا۔" انہوں نے ملازمین سے دھکے دے کر نکلوا دیا۔ ہاشم نصیر بڑی بڑی قسمیں کھاتا ہوا وہاں سے نکلا۔

وہ سوچنے پہ آیا تو سوچ گیا' اور وہ جلتا بھنتا سیڑھیاں اترتا چلا گیا مگر جو دشمنیاں مول لے لی جائیں' وہ جلدی فرو نہیں ہوتیں سو اس کا بھی سابقہ ہاشم نصیر کے آدمیوں سے پڑ گیا وہ کافی دیر تک تو لڑتا رہا مگر پھر اس کی ہمت جواب دے گئی عام سا انسان تھا' وہ' ہیرو نہیں اس لیے بے دم ہو کر گر گیا۔ سنسان سڑک پر وہ بے یار و مددگار پڑا تھا جب کسی خدا ترس نے اسے ہاسپٹل کے گیٹ تک سہارا دیا اور گیٹ کے سامنے ڈال کر گاڑی آگے بڑھا لے گیا کہ تھانہ پولیس کون بھگتتا پھرے ہاسپٹل کی انتظامیہ نے اسے فوری طبی امداد دینے کے لیے ایڈمٹ کر لیا پھر جیب سے حاکم صاحب کا کارڈ نکل آیا تو سارے مسئلے حل ہوتے چلے گئے۔ ذرا کی ذرا میں وہ سب ہاسپٹل میں تھے۔ عائنہ حاکم اس کے ہاتھ تھامے رو رہی تھی۔

"کس قدر زخمی کر دیا آپ کو۔ پلیز عظمی بھائی! آپ' آپ اب ہمارے ہاں مت آئیے گا۔ آپ کو ہمارا گھر راس نہیں۔ ہمیں تو ساری زندگی یونہی رہنا ہے۔"

امینہ نے بھی آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا پھر بولی۔

"عائنہ ٹھیک کہتی ہے عظمی بھائی! اب کے ٹھیک ہو جائیں آپ تو پھر لوٹ کے مت آئیے گا' کراچی بہت بڑا ہے کسی اور جگہ جاب کر لیجیے گا مگر ہمارے گھر نہیں' جب ہمارے بھائی کو ہماری پروا نہیں تو آپ کیوں دردسری مول لیں ہماری۔"

اس نے بے چینی سے اسے دیکھا پھر تھکے تھکے انداز میں بولا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کیا کوئی مرد ہی حفاظت کر سکتا ہے عورت کی' کیا انسان جو مجبور محض ہے وہ اپنے بل پر کسی کا محافظ بن سکتا ہے امینہ؟"

امینہ حاکم کچھ نہ بولی تو ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"یہ صرف ہمارے سطحی سے خیالات ہیں بے بی! کہ مرد' عورت کا محافظ ہو سکتا ہے کتنے گھروں کو میں نے دیکھا ہے کہ اس کے محافظ کے باوجود اس گھر کو لٹنے سے کوئی نہیں بچا پایا۔ یہ معاشرہ ہمارا معاشرہ سہی مگر یہ سب سیٹ اپ بھی تو ہم ہی بنانے والے ہیں کچھ ہم خود اور کچھ تم لوگ جو ہمیشہ اس خیال میں ہی پروان چڑھتے ہو' ایک بھائی بیماری اور پریشانی کا حل ہے۔ بھائی ایک مضبوط حوالہ سہی مگر حفاظت کرنا

حفاظت میں رکھنا تو سراسر خدا تعالیٰ کا شعبہ ہے ناں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو کب پریشانی سے نکالنے اور پریشانی سے بچالینے پر قادر ہے۔"

"کبھی بھی نہیں' یہ انسان کے بس میں نہیں۔"

"پھر تم لڑکیاں کیوں ہوکتی ہو اس نعمت کے لیے' اگر نہیں ہے تب بھی صبر کرنا چاہیے۔"

"صبر! صبر ہم کرسکتے ہیں مگر ہمارے والدین' وہ جو ہمیشہ بیٹے کو اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھتے ہیں۔ ہاں ان والدین کا کیا ہو جو ایسا سمجھتے ہیں' جو صرف بیٹے کو وارث گردانتے ہیں بیٹیوں کو رد کردیتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ بیٹیاں تو دعا اور خوشی کا روپ ہوتی ہیں۔" اس نے بابا سائیں کو دیکھا۔

"آپ! صاحب کیا آپ اب تک اولادِ نرینہ کو ہی وارث سمجھتے ہیں ؟"

بابا سائیں نے قہقہہ لگا کر یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی بچکانہ بات کہی ہو مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی رہی تو بولے۔

"بھئی عظمی! میرا کیا صدیوں سے لوگوں کا یہی خیال ہے وارث اولاد نرینہ ہی کہلاتی ہے۔"

"حالانکہ یہ ہی سب بڑا دھوکا ہے صاحب! میرے بابا کہا کرتے تھے۔ وارث' صرف نرینہ اولاد نہیں' آپ کے اچھے برے اعمال بھی ہوا کرتے ہیں۔ جب تک آپ جیتے ہیں۔ آپ کا حوالہ رہتے ہیں اور آپ کے مرنے کے بعد آپ کے نام کا حصہ بن کر رہتے ہیں۔ یہ تو ہم کوتاہ نظر ہیں جو انسان جیسی بے ثبات اور فانی چیز کو اپنی لافانی خوشیوں پر حاوی کرلیتے ہیں ہمارے نیک اعمال ہمارے لیے پھول بچھاتے ہیں صاحب اور بد اعمال' برے وارث کی طرح جگہ جگہ ہمیں رسوا کرتے ہیں پھر کیا یہ درست ہے ہم اپنے رب کی حکمت اور فیصلے سے ٹکرائیں ؟"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو' یہ درست نہیں مگر ہم میں سے کون ہے جو اس باریک نکتے کو سمجھے گا پھر ہم کیوں وقت برباد کریں ہے ناں؟ بیٹا ابھی۔"

بابا سائیں آگے بڑھ گئے تو وہ اپنی انیکسی میں اٹھ آیا پھر رونا نہیں چاہتا تھا مگر رونے لگا اچھی طرح دل کا غبار نکال چکا تو بستر پر آلیٹا کمرے کی بتی بند کردی تھی اس نے مگر یکدم ہی لائٹ آن ہوچکی تھی اور سلمان حیدر اس کے بیڈ روم کی دہلیز پر جما کھڑا تھا اسے محویت سے دیکھتا ہوا اس نے استغراق دیکھا تو پوچھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو مانی ؟۔" سلمان اندر چلا آیا پھر بالکل اس کے سامنے آکھڑا ہوا تو بولا۔

"دیکھنے آیا تھا کوئی شخص کتنا سنگ دل ہو سکتا ہے۔ کیا تم واقعی اتنے پتھر دل ہو یا پوز کرتے ہو ؟"

"کیا مطلب ؟" وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"مطلب یہی کہ اتنی ڈھیر ساری خوشیوں سے منہ موڑ کے تم آخر کسے سزا دینا چاہتے ہو؟" کچھ دیر رکا پھر بولا "میں سمجھتا تھا کہ میں تمہیں سمجھتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اب تمہارا پیمانہ صبر چھلک پڑے گا۔ تم برملا چلا کر کہو گے ضمان حیدر میں ہوں مگر میں دیکھ رہا ہوں تم اس سچ کو کہنے کے بجائے اسے چھپانے پر کمر بستہ ہو آخر کیوں ؟"

"میرے شب و روز سے واقف ہو کر بھی پوچھتے ہو کیوں؟ کیا تمہیں نہیں پتا میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔ مانی! جو کچھ میں نے کیا ہے اس کی مجھے اس سے بھی کڑی سزا ملنی چاہیے تھی۔ میں نے خود پر ان خوشیوں کے در بند کرکے خود کو بہت زیادہ مارجن دے دیا ہے میں کسی بھی حوالے سے سہی ان سب کے درمیان تو رہوں گا۔ کوئی تو ہوگا' ان کا بھائی نہ سہی بھائی جیسا ہی سہی' کیا یہ کم ہے۔" وہ رکا پھر خود ہی تائید میں بولا۔

"نہیں یہ کم نہیں۔ یہ تو میری امید سے بڑھ کر ہے مانی! اور مجھے اس انجام سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ تم اس شخص کے جذبات جان ہی نہیں سکتے جو سب کچھ لٹا چکا ہو مگر بھولے بھٹکے سے اس کے پاس ایک سکہ پھر بھی بچ گیا ہو۔ ہتھیلی پر رکھ کر دیکھو تو وہ سکہ کھوٹا لگے گا مگر کسی تہی دست کے لیے کھوٹا سکہ بھی کتنا قیمتی ہو سکتا ہے یہ تم نہیں جان سکتے سوائے میرے یا کسی تہی داماں شخص کے' جس نے واقعی سب کچھ گنوا دیا ہو۔"

سلمان حیدر پھر کچھ نہیں بولا مگر وہ اس طرح خاموشی سے بھی نہ بیٹھا ایک نئی کہانی گھڑ کر اسے واپس اپنے حصار میں کھینچ لیا' پہلے تو اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا مگر جب عائنہ حاکم نے کہا۔

"ہمیں پتا ہے آپ کتنے بڑے اداکار ہیں ضمان بھیا۔" تو وہ خوف زدہ ہوگیا۔

"کیا؟ بس یہ خوشیاں چھننے والی ہیں لیکن یہ سزا تو بڑی کڑی ہے۔" اور امینہ اس کے کاندھے سے جھول کر بولی۔

"ہمیں مانی بھیا نے سب بتا دیا ہے عظمی بھائی! اوہ' میرا مطلب ہے ضمان بھائی! آپ نے ہمیں کتنے دنوں بے وقوف بنایا ناں۔"

"کیا پتا چل گیا آخر؟۔" دل و دماغ میں دھڑکنے لگا تو اس نے خشک زبان تالو پر پھیری پھر بھرائے لہجے میں بولا۔

"کیا پتا چل گیا امینہ ؟"

اور ممو مزے سے بتائے گئی۔ "یہی کہ آپ ہی ہمارے بھائی ہیں۔ آپ یہاں گارڈ بن کر اس لیے آئے تاکہ یہاں کے حالات اور لوگوں کے مزاج آشنا ہو سکیں کہ بابا سائیں آپ کو قبول کرسکتے ہیں یا نہیں لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر سینہ سپر ہوگئے۔ حقیقی گارڈ بن کر ہماری حفاظت کرنے لگے اور یہ ہم ہی جانتے ہیں آپ نے ہمارے لیے کتنی تکلیفیں جھیلی ہیں۔"

اس نے طویل سانس لے کر سر جھکا لیا اور بابا سائیں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ دھر کر کہا۔

"ضمان! آج مجھے دوہری خوشی ملی ہے۔ مجھے دو بیٹے مل گئے ہیں۔ سلمان کو میں نے عائنہ کے لیے منتخب کرلیا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ؟۔"

"نہیں۔ نہیں تو بابا سائیں۔" اس نے بے ساختہ بابا کے سینے سے سر ٹکا دیا۔ وہ اب تہی داماں نہیں رہا تھا۔ پورے اعتماد سے مسکرا سکتا تھا اور عائنہ حاکم کے لیے دعا کرسکتا تھا کہ اس کا ہم سفر اعتبار اور اعتماد کی دولت سے مالا مال ہو اور یہ سوغات بخشنے میں سخی ہو۔

☼

سعدیہ عزیز آفریدی

اُس کی ابھی ابھی آنکھ کھلی تھی اور کمرے میں ہلکی آواز میں چلتا ٹی وی اس بات کی علامت تھا کہ شاہ میر جاگ گئے ہیں۔

دائم نے میوزک پر سر دھنتے ہوئے ہلکی سی انگڑائی کے بعد پورے بدن کو تاؤ دے کر طویل انگڑائی لی اور اپنی طرف کمر کیے کرسی پر بیٹھے ٹی وی سے محظوظ ہوتے شاہ میر کو دیکھا۔ 80 کی دہائی کا میوزک چل رہا تھا اور میوزک سنتے وقت وہ مداخلت پسند نہیں کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ سوئی جاگی کیفیت میں اٹھا اور واش روم کی طرف بڑھا۔ واش روم میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"شاہ میر! آپ نے آج پھر میرے استری کیے ہوئے کپڑے پہن لیے؟"

دائم جتنی تیزی سے باہر آیا تھا "شاہ میر کو ٹی وی کے سامنے ہی ہونا چاہیے تھا" مگر وہ اس کی چیخ سن کر ہی منظر سے غائب تھے لیکن آج دائم کا پورا ارادہ تھا کہ وہ شاہ میر سے زبردست جھگڑا کرے گا یہی وجہ تھی کہ وہ اسی حلیے میں سیڑھیاں اترا تھا مگر کھانے کے کمرے میں سب کو بیٹھا دیکھ کر دائم نے ایک نظر خود پر ڈالی بغیر شرٹ کے ہاف پینٹ اور بنیان میں کھڑا وہ عجوبہ ہی لگتا

ناولٹ

اور دادو کی لمبی فضیحت بھری تقریر شروع ہوتی وہ دانت پیستا ہوا واپس اپنے کمرے میں آیا اور اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"آپ انسان ہیں یا بھوت؟ ابھی آپ یہاں نہیں تھے۔" وہ واقعی حق بجانب تھا حیرت دکھانے میں مگر شاہ میر کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اب اس کی الماری کھولے کھڑے تھے۔

"یہ پرفیوم ڈھائی سو والا ہے نا، میں لگالوں؟" ان کے چہرے کی معصومیت دائم کا غصہ کم نہ کرسکی۔

"یہ ممو نے دیا ہے' گفٹ ہے اور پورے ڈھائی ہزار کا ہے۔"

"آ۔۔۔ ہاں منگیتر صاحبہ نے دیا ہے' لیکن یار! صرف ایک زیرو ہی تو کم لگایا تھا' پلیز اس غلطی کی اتنی بڑی سزا تو مت دے یار۔" شاہ میر گلو گیر لہجے میں بولے اور دائم کو ہنسی آگئی۔

"بس کردیں' اتنا ڈرامہ نہ کیا کریں۔" اب وہ مجبوراً اپنی ہی شرٹ پر اپنی منگیتر کے دیے ہوئے پرفیوم سے شاہ میر کو خوشبو میں بسا رہا تھا۔

"بچی کی چوائس بہت اچھی ہے' بس تھوڑی سی مار کھائی' میون ساتھی کی چوائس میں۔"

"شاہ میر! کچھ خیال کریں' وہ آپ کی کزن کی بیٹی ہے۔"

"تب ہی تو کلیجہ منہ کو آتا ہے' یہ سوچ سوچ کر مائیں اپنی بیٹیوں کے اچھے نصیب کی کیسی کیسی دعائیں نہیں مانگتیں۔" وہ لحہ بھر کو رک کے پھر رازدارانہ بولے۔

"وہ بلیک کف لنکس کہاں رکھے ہیں؟ رات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔"

"شاہ میر! آپ میرے ہاتھ سے قتل ہو جائیں گے۔ آپ کے پاس اپنا کچھ ہے؟"

"ہاں ہے میرے پاس ماں ہے' تیرے پاس کیا ہے؟" وہ اداکاری کرنے پر اتر آئے اور دائم نے ان کی ٹون ہی میں کہا۔

"شکر ہے' آپ سے بہت اچھی ماں ہے میرے پاس۔" اور شاہ میر نے آنکھیں نکال لیں۔

"قرب قیامت ہے' اپنی ماں کے چکر میں اپنی دادو کو نکما کہہ رہا ہے' نامعقول! اگر آج وہ نہ ہوتیں تو کیا اتنا اچھا باپ ملتا تجھے؟"

"شاہ میر! آپ بات کو غلط رنگ میں لے رہے ہیں۔" مگر وہ اس جملے سے پگھلے نہیں اور دائم کو الماری میں سے کف لنکس نکال کر ان کے سامنے رکھنے پڑے کیونکہ وہ اسے دھمکا ہی ایسی رہے تھے۔

"بہت خبیث ہیں آپ!" غصے میں وہ انہیں توپ قسم کی بری زبان میں خبیث ہی کہتا تھا مگر ہمیشہ کی طرح ان پر آج بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ کمرے سے جانے لگے تھے جب دائم نے یکدم شاہ میر کو روک کے پوچھا۔

"آپ کو قسم ہے' یہ بتا کر جائیں' جب میں بہت شدید غصے میں ہوتا ہوں تو آپ اک دم کمرے سے کہاں گم ہو جاتے ہیں؟" وہ قہقہہ لگا کر ہنسے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ "تمہارے غصے سے بچنے کے لیے میں شاہ زین بھیا کی ٹیرس پر کود جاتا ہوں۔"

"آپ کا دماغ خراب ہے! اگر توازن خراب ہو جائے تو آپ کو پتا ہے' آپ کا کیا حال ہوگا؟" وہ سوچ کر ہی کانپ گیا تھا شاہ زین چاچو کے ٹیرس سے اس کا ٹیرس کوئی چار پانچ فٹ دور تھا' درمیان میں صفائی ستھرائی کروانے کے لیے پیر رکھنے کے لیے شیڈ سا بنایا گیا تھا مگر یہ شیڈ اتنا چھوٹا تھا کہ عموماً استعمال نہیں ہوتا تھا اور ماہانہ صفائی کے لیے ملازمین باہر کی سمت سیڑھیاں لگوا کر اسے صاف کرتے تھے۔

"اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو؟"

"تو مجھے پتا ہے' گھر میں کسی کونے میں تبدیلی نہیں آئے گی۔ شاہ زمان بھیا تیرے پاس آکر نہیں گے آنسو پونچھ لو۔ شاہ جنید کے گھرانے کے موڈ بھی نہیں روتے۔ ساری بھابھیاں سکون کا سانس لیں گی اور شاہ احمد بھیا' وہ تو قسم سے روبوٹ ہیں۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے مجال ہے اس بندے کے اندر کوئی اتار چڑھاؤ

پیدا ہو' میں جس دن مراتب یہ بندہ ٹی وی اسکالر کی طرح بس دو منٹ کی خاموشی اختیار کرے گا اور اپنے کسی کام میں بزی ہو جائے گا۔"

"توبہ ہے شاہ! اگر آپ کے خیالات ان تک پہنچ گئے ناں کسی دن تو خوب پانی پت کی جنگ چھڑ جائے گی۔"

"چھڑ جائے' میں کوئی ڈرتا ہوں۔ اللہ جانتا ہے' اللہ کے بعد صرف اپنی ماں سے ڈرتا ہوں۔"

وہ صاف گوئی سے بولے اور نیچے چلے گئے تھے۔ تب دائم نے گہری سانس لے کر باتھ روم کا رخ کیا۔ نہا دھو کر تیار ہوا کہ والٹ اٹھاتے ہوئے اس نے عادتاً" رقم گنی اور پانچ سو روپے پھر کم پائے۔

"یہ شاہ میر بھی۔۔۔" وہ جلبلاتا ہوا ناشتے کے کمرے میں آیا اور حیران رہ گیا' وہ کینڈل کیک لیے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"ہیپی برتھ ڈے دائم۔۔۔!" اسے حیرت ہوئی کیونکہ اسے اپنی سالگرہ یاد نہیں تھی۔

"آپ کو کیسے یاد رہا اور ممو کیوں بھول گئی؟"

"وہ بے چاری کہاں بھولی تھی صبح سویرے سے فون کیے جا رہی ہے' گھر میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا' اس لیے تمہارا سیل فون آف کر دیا تھا وہ بے چاری تو کب سے کوشش کر رہی ہو گی۔" وہ مزے سے کہہ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

"یہ آپ جیسا ونگ بندہ کب سے کیدو کا پھوپھا بن گیا؟"

"بس کبھی کبھی دل چاہتا ہے ناں؟ ہم جس سے محبت کرتے ہیں' وہ صرف اکیلا ہمارے پاس ہو' ہمارے ساتھ ہو جو بیس سال میں یہ پہلی برتھ ڈے ہے جو تم میرے ساتھ گزار رہے ہو۔"

"آپ اتنا وقت کیوں دے رہے ہیں میرے لیے؟" اس نے شاہ میر کو حیرت سے دیکھا وہ مسکرا کر بولے۔

"پتا نہیں عجیب مجھے' تم شروع سے اپنے سے لگتے ہو۔ جب میں گھر آیا تو پوری زندگی میں تم میرے پہلے دوست تھے۔ مجھ سے چار سال چھوٹے مگر میرے بہت اپنے۔ بڑے بھیا کی خاموش محبت' تنبیہی لہجہ' پروا کرنا یہ سب مجھے اچھا لگتا تھا' پھر پتا نہیں بھابھی کو کیا ہوا' انہوں نے تمہارے بگڑ جانے کے ڈر سے تمہیں ہاسٹل میں شفٹ کروا دیا اور تم جانتے ہو' یہ اتنے سارے سال میرے لیے کتنے تکلیف دہ اور اکیلے تھے۔"

اور یہ سچ تھا۔ وہ پچھلے سال ہی سی ایس ایس مکمل کر کے گھر آیا تھا' پھر سول سروس کی ٹریننگ وغیرہ سے نمٹ کر تقریباً" تین ماہ سے پوری طرح شاہ میر کے زیر کنٹرول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ میر اس کے ساتھ کو انجوائے کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔

وہ شاہ میر کو سوچ کے زاویوں سے جھانک رہا تھا' جب انہوں نے چاکلیٹ کیک کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں رکھا اور خود بھی کھانے لگے۔ دائم نے اچانک پوچھا۔

"کیک مزے کا ہے مگر آپ اتنا تیار کیوں ہوئے ہیں شاہ میر؟"

"تمہاری برتھ ڈے کے لیے۔" جواب پر وہ ہنسنے والا ہی تھا کہ ماما کھانے کے کمرے میں آگئیں اور شاہ میر کو تیز نظروں سے گھور کر بولیں۔

"تمہارے پاس اپنی بھی کوئی چیز ہے؟ سر سے پیر تک دائم سے مانگی ہوئی چیزوں سے سجے کھڑے ہو۔"

"ماما...!" اس سے پہلے کہ دائم انہیں منع کرپاتا' شاہ میر ان کے قریب بڑھتے چلے گئے پھر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولے۔

"ہے ناں میرا اپنا بھی کچھ... یہ مسکراہٹ... یہ خالص میری ہے۔" وہ بولے سے مسکرائے بھی تھے اور ماما کو اس مسکراہٹ پر ہنسنے لگ گئے۔

"میں سب سے کہتی ہوں کہ شاہ میر اب گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا' مگر تمہیں اماں اور بابا کو کیا نظر آتا ہے تم میں اور باقی سب بھی تم سے کمپرومائز کیوں کرکے رکھتے ہیں۔"

"شاید اس لیے کہ انہیں لگتا ہے میں مستقبل میں کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دینے والا ہوں یاد رکھیے گا بھابھی! اگر میرا دل دکھائیں گی تو جب میں مشہور ہو جاؤں گا ناں تو آپ کو پہچانوں گا بھی نہیں۔"

وہ کچھ کہے بغیر چلی گئیں ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ سخت گرمی تھی دائم باہر لان میں سیڑھیوں پر بیٹھا تھا کہ وہ اس کے پاس چلے آئے۔

"چل ناں دائم! باہر کتنے مزے کا موسم ہو رہا ہے۔"

"کوئی نہیں ہو رہا مزے کا موسم... اتنا حبس ہے۔" اس نے گھور کے دیکھا اور شاہ میر ہنسنے لگے۔

"اچھا یہ! اماں جان کہتی ہیں جب حبس ہوتا ہے تو پنجاب میں بارش ضرور ہوتی ہے۔" وہ اس انوکھی منطق پر بے یقینی سے بولا۔

"ہاں پنجاب میں نا! کراچی میں نہیں۔ آپ کراچی کی شام میں بیٹھے ہوئے ہیں میری جان۔" اس نے شرٹ کے اوپری بٹن کھولے ہوئے تھے جب کہ وہ جینز پر کرتا پہن کر بڑے بک سک سے تیار کھڑے تھے۔

"کہاں جا رہے ہیں شاہ میر...؟" اس نے انہیں تیار دیکھ کر پوچھا۔

"بس کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں ناں! اوب گیا ہے گھر سے' چل ناں! میرا بھائی نہیں؟"

"نہیں میں نہیں جا رہا مجھے اس گرمی میں صرف گھر میں رہنا پسند ہے۔"

اس نے صاف منع کردیا اور وہ بوتھا بجھا کر بیٹھ گئے۔ دائم کا خیال تھا وہ اب خود ہی چلے جائیں گے مگر دوسرے لمحے شاہ میر نے دائم کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

"تجھے کیا لگتا ہے میں تیری جان آسانی سے چھوڑ دوں گا؟"

"مجھے کہیں نہیں جانا شاہ کے بچے" وہ تنگ کر بولا مگر وہ خاطر میں لائے بغیر اسے سنانے لگے۔

"بکواس نہ کر۔ باقی لوگوں کی طرح روبوٹ بن کر مر جانا ہے کیا؟ انسان بن یار! جیتا جاگتا انسان۔ پھول' بوروں' خوشبو' چاند کی باتیں کرنے والا' تیری میری باتیں کرنے والا' کسی کے آنسو صاف کرنے' کسی کی تسلی بننے والا عام سا انسان۔"

"مجھے عام انسان نہیں بننا شاہ! مجھے ایلیٹ کلاس میں جینے کے ڈھنگ سکھائے گئے ہیں اور آپ ساٹھ ستر کی دہائی جیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

"باتیں کرنا بھی چپ رہنے سے بہتر ہوتا ہے۔" شاہ میر سنجیدگی سے بولے۔

"آپ جیسے لوگوں کے لیے خلیل جبران کہتا ہے' باتونی لوگوں پر صرف گونگے ہی رشک کرسکتے ہیں۔"

دائم کے اس جملے پر شاہ میر کا قہقہہ گاڑی میں گونج کر رہ گیا تھا "اوئے ہوئے پوائنٹ مارتا ہے بدتمیز! شرم کر میں تیرا چاچا ہوں۔"

اس نے شاہ میر کو غور سے دیکھا۔ بے شک ہینڈسم نہیں تھے مگر خوبرو ضرور تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں' دراز قد... وہ اسے متاثر کر جاتے تھے۔ لڑکیوں کا تو

حال ہی عجب تھا۔

"مجھے پتا ہے میں آج بڑا خوب صورت لگ رہا ہوں' بلیک رنگ مجھ پر واقعی بہت سوٹ کرتا ہے۔" اس نے بریک پر پاؤں ڈالا' ان کے چہرے دیکھے' بھرے بھرے پاؤں اور اس پر ڈارک براؤن کولہا پوری۔

"تی ہیں' کچھ اکر بھاگتا ہے کیا؟" شاہ میر مسکرا کر بولے۔ وہ جھینپ گیا۔ اتنے غور سے تو اس نے کبھی اپنی منگیتر کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

"مجھے تیری صحبت خراب لگتی ہے۔" وہ شرارت سے بولے۔

اب کی بار دائم ہنس پڑا تھا "توبہ شاہ میر! کہاں کی بات کہاں لے گئے۔ یہ میڈیکر ٹائپ فلموں نے تو رشتوں کا حسن تحقیقی کر کے رکھ دیا ہے اب جہاں دو دوست بھی بیٹھے ہوں لوگ عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں انہیں۔"

"آہم یہ تو ہے' پر ہمیں کیا لوگ جو سوچیں مگر سچ تو یہی ہے نا کہ ہم جان ہیں تیری۔" یہ شاہ میر کا خاص ریشہ خطمی اسٹائل تھا یعنی اب کوئی فرمائش بم گرانے والے تھے وہ اس پر۔

"مجھے کیا کرنا ہو گا جناب کے لیے؟" اس نے شاہ میر کو غور سے دیکھا۔

"بس پانچ ہزار چاہئیں جان جگر!"

"پانچ ہزار کیوں۔۔۔ ابھی پچھلے ہفتے تو دادو اور پاپا نے الگ الگ دس' دس ہزار دیے تھے آپ کو۔"

"یار! میرے ہاتھ میں چھید ہے' پیسے رکتے ہی نہیں جتنا بھی روک لوں۔"

"بس یہی عادتیں ہیں' جو گھر بھر کی عورتیں آپ سے نالاں ہیں۔ آپ کی وجہ سے ان کا بجٹ جو خراب ہو جاتا ہے۔"

"عورتیں نہ کہو' وہ سب تو جلاد ہیں' اگر ان کا بس چلے تو ایک ہی پھونک مار کر مجھے خاکستر کر دیں۔"

"ویسے کل دادو بھی یہی کہہ رہی تھیں' اب آپ کیا کہتے ہیں؟"

ان کی مسکراہٹ میں حلاوت در آئی تھی۔ "وہ' وہ تو جنتی عورت ہیں' بلکہ جنت ہیں میرے لیے۔ اس لیے مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔ ان کی کسی بات سے مجھے اختلاف نہیں۔"

وہ ہنس پڑا۔ "میں جھوٹ بول رہا تھا۔ دادو کبھی آپ کے لیے کوئی سخت کمنٹ پاس کر ہی نہیں سکتیں۔"

"ہاہاہا۔ ظاہر ہے ان کا لاڈلا بیٹا جو ہوں' اتنا پیارا اتنا اسمارٹ کہ بس۔" وہ مصنوعی کالر اکڑانے لگے۔ دائم نے والٹ نکال لیا تھا مگر جو اضافی پانچ ہزار تھے' وہ اس میں نہیں تھے۔

"چاچو! آپ جیب کترے کب سے بن گئے؟"

"ابے چل! ہمیں کیوں بننے لگا جیب کترا۔۔۔ کسی اپنے کی جیب سے پیسے نکالنا جب کہ وہ خود بھی دینے پر آمادہ ہو' جیب کترا پن تھوڑا کہلاتا ہے' یہ تو ہنر مندی ہے۔"

"پوچھ سکتا ہوں یہ ہنر مندی جناب نے سیکھی کہاں سے؟" اس نے ابرو ترچھا کر کے پوچھا۔ وہ مسکرانے لگے۔

"ایک دوست تھا' بہت برسوں سے بچھڑا ہوا' بازار میں اچانک ملا' میری جیب تراشتے ہوئے میں نے کوٹ کے اندر سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ شرمندگی سے ہنسنے لگا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہنے لگا' وائف کے ساتھ ہوں۔ اس کی شاپنگ میں پیسے کم پڑ گئے ہیں' اس لیے تیری جیب سے قرض مانگ رہا تھا۔ میں نے والٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا' جو لینا ہے' خود لے لو۔ بس کرایہ چھوڑ دینا۔"

"کیا ایران توران کی ہانک رہے ہیں' میں آپ کے سب دوستوں کو جانتا ہوں سب ویل آف فیملیز سے ہیں۔ اور یہ کس زمانے کا واقعہ ہے کہ آپ کرائے کی بات کرتے ہیں' پندرہ برس سے آپ گھر کی ہر گاڑی پر ہاتھ صاف کرتے آ رہے ہیں چاچو۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑے "ابے اس کا مطلب ہے میں کبھی ایک اچھا واقعہ نگار نہیں بن سکتا۔ یعنی بیوی کے سامنے جھوٹ بولا تو فوراً" پکڑا جاؤں گا۔"

"تو جب جھوٹ بولنا آتا نہیں تو بولتے کیوں ہیں؟"
اس نے گھورا۔

وہ نمانے سے ہو کر بولے "کل بھابھی کو جھوٹ پر سچ پینٹ کرتے دیکھا تو مجھے لگا میں بھی اچھی خاصی گل کاری کر سکتا ہوں۔"

"کون سی بھابھی... کیا ماما...؟" دائم کے کان کھڑے ہوئے۔

شاہ میر شرارت سے بولے "ارے وہ تو جنتی عورت ہیں میں کہاں ان کے خلاف بول سکتا ہوں۔ میں تو صبا بھابھی کی بات کر رہا تھا۔ کل بھیا سے کہہ رہی تھیں شاہ میر بہت بگڑ گیا ہے۔ آج اس نے میری فرینڈز کے سامنے بڑا ندیدہ پن دکھایا جیسے اسے گھر میں کھانے کو کچھ ملتا ہی نہیں۔"

"ہوا کیا تھا...؟" وہ ایسے گھبرا گیا تھا جیسے اپنے سامنے سانپ دیکھ لیا ہو۔

صبا بھابھی گھر بھر میں ہری مرچ مشہور تھیں۔ انہیں باتوں کو رنگ لگانا، اس میں تیز مسالہ چھڑکنا خوب آتا تھا، ہر کوئی ان سے گھر میں بنا کر رکھتا تھا مگر یہ شاہ میر تھے۔ اس زمانے کے ایک عجیب ترین انسان جنہیں خطروں سے کھیلنا اور پھر جیت جانے کا جنون تھا۔

"اب بولیں بھی، آپ نے کل کیا کارنامہ کیا تھا کمپنی کی مشہوری کے لیے۔"

"کچھ بھی نہیں۔ ان کی کچھ فرینڈز آئی تھیں، سب مجھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح حیران رہ گئیں 'یہ تو تمہارے بیٹے سے چار، پانچ سال ہی بڑا لگتا ہے۔' بھابھی ایج کانشس ہیں بڑبڑانے لگیں اور میں انہیں جلانے کو وہیں بیٹھ گیا، پھر میں تھا اور بھابھی کی جھوٹی سچی تعریفیں۔ بھابھی انہیں صرف کولڈ ڈرنک پر ٹرخانے والی تھیں اور میں کمینہ پن سے سب کا پسندیدہ مینیو پوچھنے بیٹھ گیا، پھر میرے ہی منہ سے کہلوایا 'واقعی اچھا ہے' کباب کھانے کا' سو ان کے مینیو میں میں نے اپنے کباب بھی ایڈ کروا دیے۔ لو جی پھر تو بھابھی نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں فرشتہ نہ ہوتا تو بھسم ہو کر مر جاتا۔"

"شاہ میر! آپ بھی ناں..." وہ ان کے فرشتے والی بات پر ہنسنے لگا۔

وہ مزید شرارتی ہو کر بولے "بھابھی نے بھیا کے لیے کباب بنا کر رکھے تھے، کیونکہ ان کی آمد پر تھا۔ ان کا خیال تھا وہ رات کو کباب کی منہ دکھائی اکیلے میں کروائیں گی مگر میری وجہ سے انہیں فوراً محنت کرنا پڑی، پھر کھانا کھاتے کھاتے جب میں نے اپنی برتھ ڈے کا شوشا چھوڑا تو صبا بھابھی کی شکل دیکھنے والی ہو گئی تھی، وہ مجھے جھٹلا بھی نہیں سکتی تھیں۔ میں اور پھیل گیا، پھر ان کی ساری فرینڈز ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے چکر میں آگے بڑھ بڑھ کر اچھی خاصی رقم میری جیب میں ڈالنے لگیں، بھابھی دانت پیس رہی تھیں، جب میں نے معصومیت سے ان کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہا تھا۔

"کیوں بھابھی ماں! آپ مجھے کوئی گفٹ نہیں دیں گی؟"

بس پھر ان کی سرخ آنکھیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ کیا غضب تھا ان میں مگر صبا بھابھی نے پورے دو ہزار میری ہتھیلی پر رکھے تھے، کل ملا کے میں نے بیٹھے بٹھائے پندرہ ہزار کما لیے تھے۔"

"پندرہ ہزار...! آگے کہاں چاچو؟" دائم پھر حیران ہوا اور وہ قہقہہ لگا کر بولے۔

"پانچ ہزار اظفر کی جیب میں ڈال دیے تھے تاکہ جب بھابھی میری شکایتیں لگا رہی ہوں بھیا سے تو اظفر میرا وکیل بن کر میری طرف داری کرے۔"

"پھر کی اس نے طرف داری؟" دائم نے انہیں گھورا، وہ شرارت سے بولے۔

"ہاں ہاں، کی طرف داری، وہ بھی بڑی دھانسو، ویسے بھی بھیا تو بھیا... بھابھی بھی اس کی بات کو اگنور نہیں کرتیں۔"

"اس نے کیا کہا آپ کی بابت؟" دائم کو کھد بد ہونے لگی اور وہ اسی شرارت بھری ٹون میں بولے۔

"اس نے کہا پاپا! چاچو نے یہ سب ڈرامہ کوئی اپنے لیے تھوڑا کیا تھا، وہ تو چیرٹی کے لیے رقم جمع کرنا چاہتے تھے۔

آپ جانتے ہیں ماما سمیت ماما کی کئی پارٹی فرینڈز چیریٹی پر رقم اسی وقت خرچ کرتی ہیں جب انہیں وہاں میڈیا کی لائم لائٹ میں جگمگایا جائے اور چاچو ٹیک نیچی سے صرف چیریٹی کرنے کا شوق رکھتے ہیں اس لیے انہیں یہ ڈرامہ کرنا پڑا۔"

"پھر۔۔۔؟" دائم نے اور دلچسپی لی۔ وہ مزید بولے۔

"پھر بھابی نے کہا' اور وہ کباب کھا گیا سارے۔"

بھیا نے گھور کے انہیں دیکھا "بس کرو صبا اتنی تنگ دلی کا ثبوت نہ دیا کرو جیسے ہمارے لیے اظفر اور شہباز ہیں' ویسے ہی شاہ میر۔" صبا بھابی پیر پٹختی ہوئی چلی گئیں اور میں نے بھیا کے بیڈ کے نیچے انگڑائی لے کر سوچا' بیڈ کے اوپر اور بیڈ کے نیچے سونے والے ایک جیسے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے کیونکہ زمین پر چیونٹیاں اور لال بیگ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"شاہ میر! توبہ کریں۔۔۔ چاچی کو صفائی کا بہت خبط ہے' ان کے کمرے میں چیونٹیاں اور لال بیگ نہیں ہو سکتے۔"

"پتا ہے مجھے' میں تو جبران کے قول کو ٹھیک کر رہا تھا۔"

"واہ' واہ آپ اور جبران کے اقوال کو ٹھیک کریں گے۔ جانتے بھی ہیں وہ کتنا بڑا فلسفی تھا۔"

"بہت بڑا نہیں تھا۔ یہی کوئی ساڑھے پانچ فٹ کا ہو گا اور تمہارے چاچو چھ فٹ 3 انچ ہیں' پس ثابت ہوا وہ فلسفی بڑا تھا تو ہم بڑے انسان۔"

"کیا پیمانہ ہے آپ کا بڑائی ناپنے کا۔۔۔" وہ ہنسا اور پھر رازدارانہ بولا "ویسے تجسس کی بات ہے' آپ نے وہ پیسے کس چیریٹی اون میں جمع کرائے۔"

"سیدھی سی بات ہے سب سے زیادہ چیریٹی کا تو میں خود حق دار تھا۔ یتیم' مسکین بچہ ہوں' سو کر دوہ رقم خود ہی خرچ کر لی' تو کوئی غلط بات تو نہیں ہے؟"

"ہاں ہاں' کہاں غلط بات ہے آپ بھی غلط بات کر سکتے ہیں۔" وہ کالر اکڑا کر دائم کی خفگی بھری تعریف پر مسکرائے۔ ان کی گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے رک چکی تھی۔

"یہ اسپید ہوٹل بہت مہنگا ہوٹل ہے۔" شاہ میر نے عینک اتار کر دائم کو غور سے دیکھا' پھر رازدارانہ بولے۔

"خیر ہے! یہ تیری روح اندر سے اتنی غریب کب سے ہو گئی۔"

"شاہ میر! یہاں چائے کا ایک کپ ڈھائی سو کا ہے۔"

"اچھا چل تو صرف چائے پینا' ڈھائی سو روپے تو ہوں گے نا تیرے پاس؟ میں تو یہاں کے چکن چیز سینڈوچ کھانے آیا ہوں۔ ساتھ گارلک ساس والے فنگر چپس۔۔۔ Yummy۔"

"یہ آپ ایکدم سے رئیسوں والے چونچلے کب سے کرنے لگے؟"

وہ مڑ کر شرارت سے بولے۔ "جب سے مجھے پتا چلا ہے' میرا بھتیجا فارن منسٹری میں جانے والا ہے۔"

اس نے اتنی اپ ڈیٹ پر شاہ میر کو حیرت سے دیکھا پھر بولا۔ "میں نے انٹری ٹیسٹ ضرور دیا ہے مگر تین ہزار میں سے میرا سلیکشن ہو جائے' یہ ضروری تو نہیں شاہ میر۔"

"نہ ہو۔ یوروکریٹ تو بن چکا ہے نا! منسٹری بھی مل ہی جائے گی' اپنی بڑی دھوم ہے سیاسی میدانوں میں۔"

وہ اب اندر داخل ہو چکے تھے اور دائم کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے حیران تھا کہ وہ سیاسی میدان میں کہاں سے کود پڑے۔

"وہ اپنا ایک دوست ہے جلیل راؤ بہت مشہور کالم نگار ہے' اپنا یار غار ہے اور سمجھ لو' مجھے کوئی کام نکلوانا ہوتا ہے تو بس جلیل راؤ کے گلے پر پیر رکھ دیتا ہوں۔"

"توبہ توبہ شاہ میر! دوستوں کے ساتھ یہ بد سلوکی۔۔۔ آپ کو کبھی شرم بھی آئی ہے۔"

"ہاں آئی تھی' ایک بار جب میں نے بابا کے سامنے زندگی میں پہلی بار سچ بولا تھا اور بابا جان بولے تھے' بہت ہو گیا شاہ میر! اور کتنا جھوٹ بولو گے۔"

"یہ کس زمانے کی بات ہے۔" دائم نے بمشکل مسکراہٹ چھپائی تھی اور وہ اسی مسٹری شان سے بولے۔

"یہ پچھلے ہفتے کی بات ہے ویسے آپس کی بات ہے پتا نہیں بابا جان ہمیشہ میری طرف سے اتنے مشکوک کیوں رہتے ہیں حالانکہ دس بجے تک گھر آجانے والی پہلی اور آخری اولاد ہوں ان کی۔"

بھی بھی کبھی۔۔۔ دائم اب ہنسی ضبط نہیں کر سکا تھا۔

"ایک ایسی اولاد جو کوئی کام نہ کرتی ہو اس کا رات کے دس بجے آنا بھی مشکوک کر دیتا ہے۔ سارا دن کیا کرتے رہے 'یہ سوچ کر جاتے ہوں گا تو اپنا خیال ہے۔" آپ نے چھپ کر کوئی شادی تو نہیں کر رکھی۔"

"اب میں چھپ کر شادی کیوں کروں گا 'مالی طور پر اخلاقی طور پر ہر طرح سے مضبوط ہوں یار! ہاں گرل فرینڈ بہت ساری ہیں۔"

"کیا مضبوط کردار ہے۔" دائم نے پھر سے طنز کیا۔

وہ اثر لیے بغیر بولے۔

"کام نکلتے رہتے ہیں بہت سے۔ ساری اچھی کینگری کی دوست ہیں میری۔"

وہ یک دم سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے ٹیبل پر رکھے ٹشو پر کچھ لکھ کر اشارے سے ایک ویٹر کو دیا تھا۔ دائم کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ ان کی ٹیبل کا سروس عملہ ایک دم سے چینج ہو گیا تھا۔

"جی سر فرمائیے۔۔۔" ہیڈ ویٹر ان سے آرڈر لے رہا تھا انہوں نے شام کی چائے کا خاصا اہتمام کروایا تھا۔ دائم نے احتیاط" کوٹ کی جیب سے والٹ نکال کر ٹیبل کے نیچے رکھ کر پھر سے نوٹ گنے پورے پندرہ ہزار تھے "کل کی پیاسے نے بیب خرچ دیا تھا۔

پندرہ منٹ کا وقت دے کر جا چکا تھا اور اب شاہ میر دائم کو دیکھ رہے تھے۔

"کن لیے نوٹ ہو ویسے یہ کام جارجی میں تم پہلے بھی کر چکے تھے پھر ضرورت کیوں محسوس کی؟"

"اس لیے کہ میرے ساتھ ایک بہت ہی فن کار آدمی بیٹھا ہے۔ میں نے سوچا کیا پتا۔"

اب شاہ میر زور سے قہقہہ لگا کر ہنسے۔ ہنستے ہوئے ان کی آنکھیں تک ہنسنے لگتی تھیں۔

"آپ ہنستے رہا کریں شاہ میر۔۔۔" وہ بے ساختہ بولا اور شاہ میر شرمانے کی اداکاری کرنے لگے۔

"ہائیں نظر نہ لگا دینا بچے کو۔ ویسے ہی میری ماں کا خیال ہے میرا خون بڑا ہلکا ہے۔"

"بس کر دیں 'کوئی نہیں خوب صورت آپ جو آپ کو نظر لگے گی۔"

انہوں نے گھور کے دیکھا اور اسٹائل سے بولے "نظر نظر کی بات ہے۔ ماں کی نظر سے دیکھو 'دنیا کا سب سے خوب صورت انسان نکلوں گا۔"

"بس کر دیں خود ستائشی کی اس مہم کو اس کے لیے داد ہی بہت ہیں 'پتا نہیں کیا نظر آتا ہے انہیں آپ میں۔"

وہ ہولے سے مسکرائے پھر آہستگی سے بولے۔

"میں ابھی آیا۔۔۔" اور اٹھ کر ایک دم غائب ہو گئے۔

ویٹر آرڈر لگا رہا تھا 'دائم نے کچھ دیر تو ان کا انتظار کیا پھر آہستگی سے اٹھا۔ ان کا والٹ اور موبائل ٹیبل پر ہی تھا 'یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ آرڈر چھوڑ کر نہیں اٹھے۔

دائم نے شاہ میر کو ڈھونڈنے کی کوشش شروع کی تھی پھر وہ نظر آ گئے۔ وہ ایک ویٹر کا ہاتھ تھامے ہوئے اسے بہت محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے ' ہولے ہولے اس کے ہاتھ کی اوپری سطح کو دلاسے اور دھارس سے سہلا رہے تھے۔

وہ اوٹ میں ہو گیا 'تبھی وہاں سے ایک ویٹر گزرا "سنیے یہ ویٹر کون ہے؟"

"جی لو ویٹر ہے۔۔۔" سامنے کھڑا شخص بھی ایک کائیاں تھا۔ دائم نے گلا کھنکارا۔

"اس کا نام اور یہ کیسا آدمی ہے؟"

اس نے دائم کو اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر قدرے تمکنت سے بولا "شمل خان ہے اور آپ جیسے حسن پرست افراد کو ڈیل سستے داموں فراہم کرتا ہے۔"

"ڈیل۔۔۔" دائم کے منہ کا مزا خراب ہو گیا۔ یہ شاہ

میر کن چکروں میں پڑ گئے۔ کیا واقعی اب وہ اخلاقی قدروں کو ٹھوکر مار کر لذت کے راستے پر چل پڑے تھے مگر یہ تو گناہ کا راستہ تھا اور شاہ میر کو اس نے بہت اونچے سنگھاسن پر بٹھا رکھا تھا۔

دائم ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا' پانچ منٹ بعد شاہ میر واپس لوٹے۔ ان کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

"گرمی بہت ہے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا ہے تو تھوڑا سکون ملا ہے۔"

"گرمی اور یہاں ــــ" دائم کو یکدم وہ برے لگنے لگے تھے۔ اے سی کی ٹھنڈک میں گرمی کی بات نہایت احمقانہ تھی مگر وہ کر رہے تھے۔ دائم نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

"آج رات آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"آج ایک دوست کی بہن کی مایوں ہے' وہاں جانا ہے۔"

"ایک اور جھوٹ ــــ" دائم نے غصے کا گھونٹ پیا' ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ اس معصومیت کے پیچھے چھپے چہرے کو سب کے سامنے ظاہر کر دے اور پھر اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال کر ان سے ہر تعلق توڑ لے۔

"کس پر اتنا غصہ کھا رہے ہو؟ دیکھو تمہارا گلابی رنگ جل جائے گا تو مو تمہیں دیکھے گی بھی نہیں۔" مو کے نام پر ہمیشہ دائم کے ہونٹ مسکراہٹ کو چھو جاتے تھے مگر آج اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

"خیر ہے یار دل میں ہی پے کروں گا تو پریشان کیوں ہے؟"

"مجھے آپ کے ساتھ چائے نہیں پینا۔" وہ ایک دم اکھڑ گیا تھا۔

شاہ میر نے یکدم اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا "چل ناں زیادہ ڈرامے نہ کر' پی لے چائے۔" ان کے چھوتے ہی اس کا غصہ وہ ان کے ہاتھ لگتے ہی جانے کہاں چلا گیا تھا۔ "کیا شاہ میر کو کوئی جادو آتا ہے؟" دائم نے سوچا وہ اس کے لیے چائے بنانے لگے "آج چائے میں ایک چمچ شکر زیادہ ڈال رہا ہوں' تاکہ تیرے من کی کڑواہٹ کم ہو جائے۔"

وہ کچھ نہیں بولا خاموشی سے سینڈوچ کھانے لگا۔

"اماں کہتی ہیں' جس کا من سچا ہو' اس کی مرادیں بڑی پوری ہوتی ہیں۔" وہ ترنگ میں بولے اور دائم کو کُل پڑنے لگے' ویٹر۔ اس کی شرتیں اور شاہ میر کی محبت

"میرا دل چاہتا ہے آج تیز بارش ہو۔ تیرے ساتھ بارش میں بھیگے ہوئے کتنے دن ہو گئے ناں۔"

"میرے ساتھ بارش میں بھیگنے کا بڑا شوق ہے آپ کو؟" اس نے چائے کا ہلکا سا گھونٹ لیا۔ وہ مسکرانے لگے۔

"تجھے یاد ہے' جب تو کانونٹ سے چھٹی پر آیا کرتا تھا تو میں گرمیوں میں تیز دھوپ میں کیسے کیسے بارش کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔ مجھے بارش بھی اپنی گرل فرینڈ لگتی تھی' اس زمانے میں تو شمع باجی اور آصفہ باجی کی طرح وہ میری سہیلی ہوتی تھی اور میرا دل چاہتا تھا میں سارا دن ساری رات بارش میں بھیگتا رہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اچھا لگتا تھا ایسا کرنا۔"

"مگر کیا تب آپ کی دعاؤں پر بارش ہو جاتی تھی؟" وہ ابھی بھی اکھڑا تھا۔

مگر وہ توجہ دیے بغیر بولے "ہاں کبھی کبھی ہو جایا کرتی تھی مگر تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میرے ساتھ کبھی بارش انجوائے نہیں کی ہو۔"

"مجھے بارش اچھی نہیں لگتی۔" دائم نے سرسری سا کہا۔ وہ ایک لمحے کو چپ ہوئے اور پھر بولے۔

"یعنی تجھے میں اچھا نہیں لگتا مگر یہ اچانک اتنا بدلاؤ کیوں؟"

"کچھ چیزیں بس اچانک ہی وقوع پذیر ہو جاتی ہیں جیسے ــــ جیسے ــــ"

"جیسے اچانک ہونے والی بارش۔" وہ ایک زوردار خوشی بھری قلقاری مار کر بولے۔ دائم نے گلاس ونڈو سے دیکھا' باہر واقعی بارش ہونے لگی تھی۔

"چل ناں! بارش میں بھیگتے ہیں۔" وہ بل ادا کر کے یکدم اٹھ کھڑے ہوئے' دائم ان کے ساتھ کھنچا چلا آیا

تھا پھر وہ ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں کھڑے تھے۔

"گاڑی میں نہیں جا رہے۔ میں نے شاہ زین بھائی کے بیٹے کو بلا لیا ہے' وہ گاڑی گھر لے جائے گا۔"

"تو ہم یہاں شہباز کے آنے تک کھڑے رہیں گے۔" اسے غصہ آ گیا تھا ان کی اس لاپروائی پر۔

"نہیں' میری گاڑی کی ایک چابی شہباز کے پاس بھی ہے وہ خود ہینڈل کر لے گا۔"

انہیں کسی بھی بات سے پریشانی نہیں ہوتی تھی مگر اسے ہو رہی تھی "آپ اس سترہ سال کے بچے کو بلا کر یہ گاڑی ہینڈل کرنے کو کہہ رہے ہیں اگر کوئی حادثہ ہو گیا تو؟"

"کبھی اچھا بھی سوچ لیا کرو۔ وہ کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے میری گاڑی استعمال کر کر کے اب اس کا ہاتھ بہت رواں ہو گیا ہے۔" انہوں نے دائم کے اس خدشے کو بھی رد کر دیا تو اس نے ایک نئی بات نکالی "رات کے آٹھ بج رہے ہیں اگر راستے میں ٹریفک پولیس نے پریشان کر دیا تو......"

"نہیں کرے گا میرا نام ہی کافی ہے۔"

"آپ کوئی پرائم منسٹر ہیں۔ امریکن صدر کے چچیرے بھائی لگتے ہیں جو آپ کا نام ہی کافی ہے۔"

"ہائے توبہ ہے دائم! میرا رنگ گندمی ہے' کالا نہیں کیا ہو گیا ہے تیری عقل کو۔" وہ اسے بالکل خاطر میں نہیں لا رہے تھے اور دائم کو ان کی یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"پکوڑے کھائیں گے۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' وہ ایک نئی فرمائش اٹھا لائے۔

"آپ کا پیٹ ہے یا ہائی کورٹ کا دفتر؟" وہ ہنسنے لگے' پھر اتر گئے بلکہ وہ سڑک کنارے شیڈ کے نیچے کھڑے پکوڑوں کا آرڈر دے رہے تھے۔

"پودینے کی چٹنی زیادہ ڈال کے دینا۔"

"آپ کی ساری عادتیں لڑکیوں والی ہیں' خواہ مخواہ آپ کو شاہ میر بنا دیا اللہ جی نے۔" وہ پھر ہنسنا شروع ہو گئے۔ انہیں کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ زبردستی اسے بھی کھلا رہے تھے' پکوڑے ختم ہو گئے تھے اور اب وہ چٹنی کے گھونٹ لے رہے تھے۔

"خدا کا خوف کریں' سینہ جل جائے گا آپ کا۔" مگر سنتا کون! وہ چٹنی کے بعد ہاہا کر کے چٹنی کی تیزی سے پریشان تھے۔ "آئس کریم کھائیں؟" دائم نے جل کر کہا اور وہ مسکرانے لگے۔

"گڈ آئیڈیا' چلو اسی لین میں پشاوری آئس کریم پارلر ہے' وہاں دو گھڑی بیٹھ کر آئس کریم کا لطف اٹھاتے ہیں۔"

"دو گھڑی تو ایسا کہہ رہے ہیں جیسے میں سالوں بعد آپ سے ملتا ہوں' روز ہوتا ہوں آپ کے ساتھ۔ یار! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"کچھ نہیں' مگر ایک بات یاد رکھنا جو آپ کے ساتھ روز ہو' آپ کے شب و روز میں گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح شامل ہو ضروری نہیں وہ واقعی دل سے بھی آپ کے ساتھ ہو آپ کے پاس ہو' کیا پتا وہ صرف آپ کے ساتھ یوں ہی گھسٹتا پھر رہا ہو۔"

دائم کو یکدم کچھ عجیب سا لگا مگر پھر وہ کچھ نہیں بولے تھے خاموشی سے آئس کریم ختم کر کے اٹھے تھے اور آٹو رکوا کر آٹو والے کو گھر کا پتا سمجھانے لگے۔

"آپ میرے ساتھ نہیں چل رہے؟"

دائم کو لگا' وہ خفا ہو گئے ہیں اس کے رویے پر' مگر انہوں نے اس کا گال چھو کر کہا تھا۔

"پے منٹ کر چکا ہوں' یہ تمہیں آسانی سے گھر پہنچا دے گا۔" لمحہ بھر رک کے پھر آہستگی سے بولے۔

"اتنی دیر برداشت کرنے کا شکریہ میری جان!" اب ان کی پشت تھی اس کی طرف۔

"آپ نہیں چلیں گے گھر؟" وہ مڑے بغیر بلند آواز میں بولے۔

"نہیں' مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔ بابا سے کہہ دینا' تھوڑی دیر ہو جائے گی آج۔" آٹو کی تیز آواز اور شاہ میر کا ناقابل فہم رویہ' دائم نے کچھ دیر تو سوچا مگر پھر ساری توجہ گھر پر لگا دی' مسز انساء کی آٹھ دس مس کالز وہ دیکھ چکا تھا' اس لیے اسے منانے کے لیے لفظ جوڑ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ تیز قدموں سے بارش میں بھیگتے ہوئے جا رہے تھے' جب بہت اچانک ان کے قریب ایک کار آ کر رکی پھر جو شکل ان کو نظر آئی تھی اسے دیکھ کر وہ جی جان سے جل گئے۔

"اتنی بارش میں کہاں گھومتے پھر رہے ہو' تمہیں پتا بھی ہے کیا وقت ہو رہا ہے اور یہ کراچی کی بارش ہے اتنا پانی جمع ہے سڑکوں پر' یہاں مین ہول کھلے پڑے رہتے ہیں اور....."

"پلیز زمان بھیا! کوئی نیوز جیو کے لیے بھی رہنے دیں۔" لمحہ بھر کو رک کے پھر مزید بولے۔

"کیا آپ چاہتے ہیں میں آپ کے ساتھ چلوں؟"

"نہیں مجھے اپنی گاڑی خراب نہیں کروانا۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہیں آٹو کا کرایہ دے سکتا ہوں۔"

"چلیے نکالیے کرایہ....." وہ یکدم ہاتھ پھیلا کر شرارت سے بولے۔

اور شاہ زمان بڑبڑاتے ہوئے والٹ نکالنے لگے "سو روپے کافی ہیں؟"

"سو روپے میں کیا ہوگا بھیا' پانچ سو روپے تو دیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولے۔

"تم کیا کرتے ہو اتنے پیسوں کا؟ جب دیکھو ہاتھ پھیلائے کھڑے ہوتے ہو۔"

وہ مسکرا کر انہیں دیکھنے لگے تھے پھر ہنس کر بولے

"آج کل وڈیروں سفیروں کے ساتھ بیٹھنے لگا ہوں اس لیے ہاتھ کھلا' زبان خاموش ہو گئی ہے۔"

"خوش فہمی ہے کہ تم خاموشی کا سمبل ہو۔" شاہ زمان نے نخوت سے کہا اور وہ اثر لیے بغیر بولے۔

"بدگمانی کرنے سے بہتر ہے خوش گمانی پال لی جائے ویسے سب بھائیوں میں آپ مجھے بہت [illegible] لگتے ہیں۔"

شاہ زمان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ کوئی غصے میں ہو اور آپ اس کی تعریف کر دیں تو وہ ہکا بکا رہ ہی جاتا ہے۔

انہوں نے کچھ کہے بغیر گاڑی آگے بڑھائی اور وہ اسی طرح سڑک پر بارش میں نہاتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ٹریفک بری طرح جام تھا' یہی وجہ تھی وہ رک کر ٹھہر کر' ٹہل کر بھی نہ کسی طرح گھر پہنچ ہی گئے۔

"تم کہاں نکلے ہوئے تھے؟ دائم تو کب کا گھر آ چکا ہے۔" نیلوفر بھابی نے ان کے لتے لیے وہ گیٹ سے آگے آنے کے بجائے چوکیدار کی کرسی پر ہی بیٹھ گئے۔

"سانس تو لینے دیں بھابی ماں! ساری انفارمیشن کا تبادلہ ہوگا میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

چوکیدار شیڈ کے نیچے کھڑا تھا اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہے تھے گھر کی باقی عورتیں جا چکی تھیں' صرف نیلوفر بھابی کھڑی تھیں یا تازہ اطلاع پر اماں جان بھاگی ہوئی آئی تھیں۔

"کتنا بھیگ گیا ہے شاہ میر چل جلدی سے کپڑے بدل لے ورنہ بیمار پڑ جائے گا۔" اماں کھینچ کھانچ کر انہیں اندر لے گئی تھیں وہ تولیے سے اس کے بال خشک کرتی رہیں۔ نیلوفر بھابی ان کا کرتا اور ٹراؤزر اٹھا لائیں۔

"تمہیں پتا ہے تم بیمار پڑ جاتے ہو بارش میں بھیگ کر پھر بھی ہر بار انہیں انجوائے کرتے ہیں۔"

نیلوفر بھابی بڑبڑائیں اور وہ اماں کے واش روم میں کپڑے لے کر گھس گئے۔ پانچ منٹ بعد باہر تھے اور اماں چائے کا بڑا مگ ان کے سامنے رکھ رہی تھیں۔

وہ چائے پینے کا ارادہ باندھ ہی رہے تھے کہ نیلوفر بھابی ان کے لیے پیناڈول لے آئیں "یہ کھا لو تاکہ طبیعت خراب نہ ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے گولیاں نگل گئے اور دادی اماں کے کمرے میں کھلنے والی باغ کی طرف والی کھڑکی سے جھانکتے دائم کو ان کی اتنی خاطر مدارات دیکھ کر برا لگا۔

"پتا نہیں ان سب کو کیا دکھتا ہے شاہ میر میں....." اس نے بہت الگ طرح سے آج شاہ میر کے بارے میں سوچا تھا۔ یہ وہ سوچ تھی جو اس گھر میں بہت

سارے ذہنوں میں پیدا ہو جاتی تھی۔

وہ باہر کوریڈور میں کرسی پر بیٹھا بارش کو برستا دیکھ رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ شاہ میر کو کچھ دیر کے لیے نہ دیکھے۔ مہو سے ابھی ابھی اس کی بات ہوئی تھی اور وہ اس پر غصے سے الٹ پڑی تھی کہ شاہ میر نے اس کی آواز سن کر فون کاٹا تھا اور یہ کہ وہ کون ہوتے ہیں ظالم سماج بننے والے اس نے کہا بھی وہ صرف اس کے چاچو ہی نہیں اس کے دوست بھی ہیں مگر اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔

"دوست محبوب کی جگہ نہیں لے سکتا۔" آخری فقرہ اس کا یہی تھا اور وہ اس وقت بھی مہو کے اسی فقرے کے ساتھ اکیلا بیٹھا تھا۔ دل بے چین تھا۔ ہوٹل والی ادھوری اسٹوری اس کے دماغ میں اودھم مچائے پھر رہی تھی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا کہ اچانک کسی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"یہ آج کل تم پرانی فلموں کی سوتیلی ماں کی طرح ہونٹ کیوں کاٹتے رہتے ہو۔"

"مجھے آپ سے اس وقت کوئی بات نہیں کرنا۔" اس نے بے مروتی کی انتہا کر دی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔

"خیر ہے' بہ نصیب دشمناں آج موسم اتنا گرم کیوں ہے؟"

"آپ مجھے اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ جب آپ کا دل چاہے میں بات کروں' آپ کا دل چاہے میں ہنسوں' ہنستے لگاؤں میں کوئی جوکر ہوں یا کوئی کھلونا؟"

شاہ میر سکتے کی کیفیت میں اسے دیکھتے رہے پھر یکدم اپنے کندھوں پر پڑی شال جھٹکے کر وہاں سے غائب ہو گئے۔ دائم کہنے کو تو مہو کے غصے میں انھیں برا بھلا کہہ گیا مگر اب دل کم ہونے پر اسے لگ رہا تھا وہ بہت زیادتی کر گیا تھا ان کے ساتھ۔

پھر دوسرے دن صبح ناشتے کی میز پر بھی وہ نظر نہیں آئے تو اسے حیرت ہوئی' رات کو وہ اس وقت کمرے میں آئے تھے جب وہ سو گیا تھا اور جب اٹھا تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھے۔

"شاہ میر کہاں ہیں۔۔۔؟" اس نے دادی جان سے پوچھا۔

وہ فکر مندی بولیں "پتا نہیں کل سے کیا ہو گیا ہے' کچھ بول ہی نہیں رہا بس خاموشی سے آفس کے کاموں میں لگا ہوا ہے۔"

"آؤٹ ہاؤس میں ہیں کیا؟" شاہ میر اور آفس کے کام۔ اسے حیرت ہوئی' دادی نے آہستگی سے سر ہلایا اور وہ ناشتے کی ٹرے لے کر آؤٹ ہاؤس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

دادو جان شاہ میر کو کچھ ڈکٹیٹ کروا رہے تھے اور وہ ان کے لفظوں کو ای میل میں ڈھال رہے تھے۔

"السلام علیکم دادو!" دائم نے با آواز بلند سلام کیا۔ شاہ میر نے ذرا بھی توجہ نہ دی تو اسے دھکا سا لگا۔

"کیا آپ بہت مصروف ہیں شاہ میر؟"

"جی بابا! وہ سائن اینڈ سائن کے سلسلے میں بھی آپ کچھ کہہ رہے تھے' انھیں بھی ای میل کرنا ہے؟"

"نہیں میری ان سے کل بات ہو گئی ہے۔ وہ معاملہ حل ہو گیا ہے۔ پے منٹ میں کچھ ڈیلے تھا۔ اس کا چیک امپرو ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے بابا! پھر میں چلتا ہوں' مجھے آج کچھ بہت ضروری کام ہیں۔ رات کو بھی بہت دیر ہو جائے گی۔"

دائم کو پھر رات اور دیر جیسے جملوں نے ڈنک مارا تھا۔

"آپ کبھی نہیں سدھر سکتے۔ پتا نہیں اچھے بھلے راستوں پر چلتے چلتے کہاں کی خاک چھاننے نکل پڑتے ہیں۔" وہ دل میں سوچتا ہوا ناشتے کی ٹرے واپس لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

اکیلے ناشتے کی اسے عادت تھی مگر شاہ میر کے ہوتے ہوئے اکیلے ناشتہ کرنا اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا اور وہ خود بھی اس کے بغیر ناشتہ نہیں کر سکتے تھے۔

"میرا دل چاہتا ہے میرا ایک ٹرسٹ ہو جس کے وسیلے سے بھوکے لوگ تینوں وقت کھانا کھائیں اور مجھے دعائیں دیں۔ اکیلے ناشتہ کرنا بڑا عجیب لگتا ہے۔"

وہ جس سے چڑ رہا تھا اسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔

اس نے صرف ایک سلائس کھایا تھا اور ٹیرس پر آکر بیٹھ گیا۔ بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بہت مٹھاس بھری آواز نے اسے چونکا دیا۔

"عائشہ باجی! آپ اتنی اچانک۔"

"بس ہر بار سوچتی تھی تم سے ملنے کا مگر اس بار جب سنا تم آئے ہو تو میں نے کہہ دیا ایک ہفتے رکوں گی سو ماموں جان کے گھر آگئی مگر یہ لیلیٰ مجنوں کی جوڑی ایک ساتھ کیوں نظر نہیں آرہی؟ ماموں جان کہہ رہے تھے۔ بہت مصروف رہنے لگا ہے شاہ میر۔"

"پتا نہیں مجھے بھی یہ اطلاع دادو جان سے ہی ملی ہے آج۔"

"کیا بات ہے تم اور اس کے ذکر پر اتنے اکھڑے اکھڑے سے ہو۔"

"بس کچھ نہیں عائشہ باجی! ایویں تھوڑا بور ہو رہا تھا۔"

"واہ! تم اور بور ہونے لگے۔ شاہ میر اور تمہارے قصے تو آج تک ہم لوگ مزے سے دوہراتے ہیں۔ سارے بچے تم دونوں کے دیوانے ہیں بھئی۔"

وہ دھیمے سے مسکرانے لگا اور وہ ہنس کر بولیں

"آصفہ کی شادی ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی۔ سب کتنا حیران پریشان تھے اور شاہ میر دس برس کے ہو کر بھی کیسے کمپوزڈ تھے۔"

وہ ہنس پڑا۔ یکدم اسے اتنی پرانی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ وہ آصفہ باجی کی شادی کی وجہ سے تمیں تحقیقات کر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سوال کرتے پھرتے ہر رشتے میں نقص نکالتے۔ بڑوں کے سامنے تو چپ رہتے مگر آصفہ کو کہتے آصفہ باجی الفرنٹ کریں لڑکا کنجوس ہے۔ کبھی اس کی باتوں سے اندازہ لگا کر کہتے "لڑکا اچھا نہیں ہے اس کی آنکھیں دائیں بائیں چک پھیریاں لیتی ہیں ایسے لڑکے تیز اور دل پھینک ہوتے ہیں۔

"ہاں۔۔۔ سب عمر سے بڑی باتوں پر ہکا بکا رہ جاتے مگر تحقیقات میں جب کوئی نقص معلوم ہوتا ان کے کہے ہوئے لفظوں سے انیس بیس کا فرق ہی ہوتا۔

پھر آصفہ باجی کی شادی طے ہوئی اور انہوں نے وہ ہنگامہ کیا کہ الاماں میوزک ڈانس یہاں تک کہ شادیوں کی وہ جان بن گئے جہاں باقی لڑکوں کا داخلہ ممنوع ہوتا شاہ میر وہ مزے ہوتے جب آصفہ باجی کی شادی ہوئی تو اس وقت شاہ میر کالج میں تھے انہوں نے صرف آپس میں تین دن ڈھولکی کی قرارداد پاس کی بات بابا جان تک پہنچ گئی تو وہ تپ گئے۔

"شاہ عالم کے گھرانے کے لڑکے گانا بجانا نہیں کرتے۔"

وہ بابا جان کے سر ہو گئے۔ "پلیز بابا جان! تین دن تک بھول جائیں ناں آپ شاہ عالم ہیں۔"

"کیا بکتے ہو؟ میں یہ بھول جاؤں کہ میں شاہ عالم ہوں تو پھر کیا یاد رکھوں؟"

"آپ خود کو کشور واچی سمجھنے لگیں۔ پلیز بابا جان! یہ نیا زمانہ ہے کرنے دیں ناں بے چاری لڑکیاں ان کے اچھے لگنے کے دن تو وہ تین دن ہوتے ہیں پھر تو چلی جاتی ہیں یہ۔۔۔ عائشہ باجی اور آصفہ باجی کی طرح پھر تھوڑی کر سکتی ہیں اپنی من مرضی۔۔۔" بابا جان نے ان کی صورت دیکھی لفظوں کا چناؤ دیکھا اور کہا۔

"او کے! مگر ایک بھی آواز میں بجے گی۔"

یوں شادی کے وہ لمحات بے حد یادگار ہو گئے تھے۔ وہ ساری ساری رات باتیں کرتے۔ اماں جان چاچی جی آکر کہتیں۔

"بچی کو آرام کرنے دو۔۔۔" اور وہ صاف کہہ دیتے۔

"پلیز اماں جی! یہی دن تو ہیں جب ہم ان کے پاس اتنے حق سے بیٹھے ہیں پھر تو بہنوئی صاحب ہوں گے اور ان کی جی حضوری۔"

"آصفہ باجی چھوڑ کے جاتیں یہ خاموش عہد تھا کہ وہ بیاہوں کے بعد چھوڑ کنے کی ضد نہیں کریں گے۔ سب کزنز اور بہن بھائیوں نے اس خاموش عہد پر

دستخط کر رکھے تھے۔ وہ سب باتوں میں مگن رہتے "شاہ میر آصفہ باجی کے بعد اب عائشہ باجی کی خدمت داری کر رہے تھے" جو فرمائش منہ سے نکلتی "فوراً" پوری ہونے لگی تھی۔ عائشہ باجی بھی حیران تھیں۔

وہ اتنے دھڑلے سے خرچ کر رہے تھے کہ دائم کو شبہ ہوا کہیں شاہ میر آج کل ہاتھ کی صفائی تو نہیں دکھانے لگے' دل کو تسلی نہ ہوئی تو ان کی غیر موجودگی میں اس نے ان کی الماری کھنگال ڈالی۔ تب وہ ہکا بکا رہ گیا آمنہ باجی' عائشہ اور شمع باجی کے نام کے منی باکس رکھے تھے' تمام ٹیگ کیے ہوئے اور ہر باکس میں اچھی خاصی رقم تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے یہ رقم جمع کر رہے تھے اور اب شادی کے بعد بھی یہ باکسز خالی نہیں ہوئے تھے۔

"کیوں شادی کے بعد آپ پیسے کیوں جمع کرتے ہیں؟" رات گئے اس نے پوچھا تو وہ مسکرا کر دوستانہ بولے۔

"بہنیں ہیں یار! اتنا سا دل ہوتا ہے' اتنی سی بات پر خوش ہو جانے اور اتنی سی بات پر روٹھ جانے والا' بڑی نرگسی طبیعت ہوتی ہے ان کی۔ اگر کوئی ان کی پروا کرنے لگے بجائے صرف لفظی یا پھر میری طرح لفظی اور عملی دونوں تو ان کے اندر کا جو مان بھرم کا بند ارہے نا' اونچا رہتا ہے اور جب یہ اونچا رہتا ہے تو چھوٹی سی لڑکی کے اندر کا مورال بھی اونچا رہتا ہے۔ اعتماد اعتبار سب کچھ ان کے لہجے سے زور سے چھلکیاں مارتا ہے۔ ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے بھی زیادہ خوب صورت ہوتی ہے اور میں یہی چاہتا ہوں کہ ان کے اندر کی لڑکی ہر وقت مسکراتی رہے۔"

کتنا گہرا سوچتے ہیں یہ شاہ میر۔ اس نے آج پھر سے نئی طرح سے سوچا تھا اور اپنی غلطی بہت عجیب سی لگی تھی۔ عائشہ باجی جانے کیا دنیا جہان کی باتیں کر رہی تھیں اور وہ ان کی چھوٹی بیٹی کو گود میں لیے ماضی کو کھنگال رہا تھا۔ ایک شخص جو دنیا کی پروا' رشتوں کی پروا سے افضل نہیں سمجھتا' وہ کیسے کرپٹ ہو سکتا ہے بھلا

نے مشورہ دیا اور اس نے ایک بار پھر سے شاہ میر کی تلاش شروع کی لیکن جب تک وہ آفس پہنچا' وہ وہاں سے نکل رہے تھے۔

"میں کچھ بھی کہہ کر مناؤں گا نہیں۔ میں غلط تھا۔ ہر رشتے کی قدر حیثیت' دوسرے رشتے سے الگ سہی مگر ضروری ہوتی ہے۔ ایک رشتے کو نبھانے کے لیے پہلے کے کسی رشتے کو گنوا دینا عقلمندی تو نہیں۔"

وہ سوچے جا رہا تھا اور ان کی گاڑی کا پیچھا کر رہا تھا پھر وہ چونک گیا۔

"ہاسپٹل..... کیوں؟" ایک بڑا سا کیوں اس کے اندر ڈنگ مارنے لگا۔

"ہوگا کوئی جان پہچان کا بندہ ایڈمٹ' شاہ میر کو بھی تو ہر کسی سے خلوص اور محبت کی پینگیں بڑھانے کی عادت ہے' ہر اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے شخص سے انہیں انسیت ہو جاتی ہے۔"

وہ گاڑی سے باہر نکلا اور فاصلے سے ان کا تعاقب کرنے لگا۔

یہاں تک کہ انہوں نے کوریڈور میں چلتے ہوئے ایک ڈاکٹر کو دیکھ کر پکارا تھا۔

"ڈاکٹر سعید! میں شاہ میر' میری آپ سے اپنے کیس کے سلسلے میں بات ہوئی تھی۔"

"او ہاں! دا لو سرجری کا کیس' جی جی میں نے دیکھ لیا ہے۔ آپ چل کر میرے روم میں بیٹھیے۔ میں بس پندرہ منٹ میں آپ کے پاس آتا ہوں۔"

دائم ٹھنڈے کوریڈور میں یکدم برف ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا وہ مارچری میں پڑی ہوئی کوئی لاش تھی جس کا پوسٹ مارٹم ہونے جا رہا تھا۔

"گر لاش کو تکلیف کا احساس کب ہوتا ہے" اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا تھا۔

"سوری سر! اسموکنگ الاؤ نہیں ہسپتال میں۔" اس کے کپکپاتے ہاتھ جو لائٹر سے شعلہ دکھانے والے تھے یکدم بے جان ہو کر پھر سے گر گئے تھے۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور اپنی کار کے کھلے دروازے پر ہاتھ رکھ کر

اس نے گہرے گہرے سانس لیے تھے مگر آنسو رک ہی نہیں رہے تھے۔

وہ گاڑی کی سائیڈ پر لے گیا تھا پھر پتھر پر بیٹھ کر کتنے ہی منظر اس کی نظروں کے سامنے پھر گئے تھے۔ وہ ماضی میں داخل ہوا تھا اور شاہ میر اس کے لیے لڑ رہے تھے۔

"نہیں اگر دائم شامل نہیں ہوگا کرکٹ میں تو میں بھی نہیں کھیلوں گا۔"

"چاچو! دائم بھیا کی بیٹنگ فیلڈنگ بولنگ کچھ بھی نہیں اچھی۔ آپ بلاوجہ ضد کرتے ہیں۔"

"نہ ہو کچھ بھی اچھا مگر یہ میرا شیر ہے جہاں میں ہوں گا وہاں یہ ہوگا جہاں یہ ہوگا وہاں آف کورس میں ہوں گا۔"

نہیں چاچو! آپ کچھ بھی کہہ لیں ہم دائم بھائی کو نہیں کھلائیں گے۔ ایک تو پہلے یہ کھیلتے ہیں پھر جب ڈانٹ پڑتی ہے تو صاف بچ جاتے ہیں۔ الٹی ہم سب کی شکایتیں لگاتے ہیں دادو جان اور بی جان کو۔"

"تو کیا ہوا یار! بچہ بڑا ہو کر سیاست دان بنے گا۔ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔"

"کیسے؟ آپ کو یہ کیسے پتا یہ سیاست دان بنیں گے؟" ایک بچہ پوچھتا اور وہ فس کر کہتے۔

"ایک کامیاب سیاست دان یا بیورو کریٹ وہی ہوتا ہے' جب گنگا بہہ رہی ہو تو دونوں ہاتھ دھوتا رہے اور جب پکڑ دھکڑ شروع ہو تو مسکین بن کر اگلی حکومت میں سیٹ لینے کے لیے سارے پرانے جرائم اور کرپشن کے پلندے دوسروں پر ڈال دے۔"

"ہاں تو پھر بھی آپ کہتے ہیں یہ قابل اعتبار ہیں۔"

"ہاں یار! اپنا یار ہے جیسا بھی ہے قبول ہے۔"

اس نے بہتے آنسوؤں کو صاف کیا۔ وہ ہمیشہ ہی ہر موقع پر انہیں بیچ میں چھوڑ کر خود الگ ہو جاتا تھا' کچھ بی جان اور دادو جان کا ڈر اور کچھ اپنی سخت گیر ممی جان کا خوف' مگر شاہ میر تو ہمیشہ ہی اس کی خاطر ہر جھگڑا مول لیتے تھے اب بھی وہ اسی کی خاطر یہ مشکل فیصلہ کر کے سکون لائے ہوں۔

اسے کالج کا وہ دن یاد آنے لگا جب شاہ میر نے لڑکیوں میں مقبول رہنے کے لیے پامسٹری سیکھی تھی' بے ساختہ

مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر در آئی' پھر اسے وہ دن یاد آیا جب ایک بہت ذہین طالبہ کے نوٹس کی دھوم پر اس نے ان سے کہا تھا۔

"مجھ سے محبت کرتے ہیں تو اس کے نوٹس لا کر دیں۔ میں اپنی حیثیت اس کالج میں بہت شان دار چاہتا ہوں۔"

اور شاہ میر وہ پہر تک اس لڑکی سے مل بیٹھے تھے پھر وہ اسائنمنٹ کے لیے صرف منہ ہلا دیتا اور اس کا اسائنمنٹ بغیر محنت کے وقت پر تیار ہوتا' ہاں یہ اور بات تھی کہ وہ اس سے دور ہو گئے تھے۔ ان کا موبائل بڑی آنا راتوں کو بھی وہ دیر سے آتے۔

"محبت کا چکر ہے۔" اس نے جان کر انیس بھائی کے سامنے کہا' جانتا تھا وہ یہ خبر پورے گھر میں نشر کر دیں گے' تہمات آگے نہیں بڑھی تھی۔

"کالج میں یونیورسٹی میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ شاہ میر بہت سمجھدار ہیں۔"

"ہوگا مگر میں اس آوارہ لڑکے کے ساتھ اپنے بیٹے کو مزید نہیں رکھ سکتی۔ مجھے شاہ بہروز کی بات ماننا ہی نہیں چاہیے تھی' اولیول کے بعد مجھے اسے یہاں بلانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بس طے ہو گیا۔ دائم اگلے ہفتے سے پھر اسلام آباد جا رہا ہے' اپنے ماموں کے گھر' وہ جتنا شاہ میر سے دور رہے گا اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہے۔"

"مت جاؤ ناں!" وہ کمرے میں آیا تو انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر منت سے کہا۔

"یہ ماما کا فیصلہ ہے شاہ میر! مجھے جانا پڑے گا۔"

"اگر تم کہہ دو کہ تم نہیں جانا چاہتے تو بھابی بھی ضد نہیں کر سکیں گی۔" انہوں نے اسے گھیرا اور دائم بہروز کی آنکھوں میں چمن سے "مہو" کا سراپا گھوم گیا۔ وہ جس عمر میں تھا اس میں انسان فطرتاً' نہ بھی ہو تب بھی مصلحتاً' تھوڑا خود غرض ہو ہی جاتا ہے۔

"میں تمہارے بغیر کیا کروں گا کالج میں۔"

"کیوں کالج میں تو آپ کی لڑکیوں میں بڑی دھوم ہے پھر وہ نئی لڑکی رانیہ بھی تو ہے۔"

"میں نہیں جانتا کسی رانیہ شانیہ کو۔ میں اس کے پاس صرف تمہارے نوٹس لینے کے لیے گیا تھا مگر بدتمیز نے صاف منع کردیا۔"

"پھر وہ سال بھر نوٹس کہاں سے آتے رہے؟" دائم حیران ہوا تھا مگر شاہ میر کچھ کہے بغیر چلے گئے تھے۔

"تیرے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں میری جان۔" ہر معاملے، ہر فرمائش پر ان کا یہی جواب ہوتا تھا اور اب وہ کچھ کہے بغیر چلے گئے تھے تو اس کے اندر یہ فقرہ کسی شرارتی بچے کی طرح دوڑتا پھر رہا تھا۔

"بہت تھک گیا ہوں یار سونے دے۔" یہ وہ جملہ تھا جو پھر اس نے سارا سال سنا تھا اور پھر ان کی تھرڈ ڈویژن آنے پر گھر میں کتنا ہنگامہ ہوا تھا۔

"پڑھنے جاتے ہو یا گھاس کھودنے؟"

"کوک کی بوتلیں جمع کرنے۔" وہ شاہ زمان چاچو کی بات کا اثر لیے بغیر بولے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"کوک کی بوتلیں جمع کرنے کا مطلب؟ دائم! یہ تمہارے چاچو کیا کرتے تھے کالج میں؟"

"چاچو! کوک کی ایک بوتل کینٹین میں دینے کی ایک معقول رقم ملتی ہے اسٹوڈنٹ کو۔"

"یہ کالج کی انتظامیہ ہے یا کباڑ خانہ؟ بچے اس لیے جاتے ہیں یا پڑھنے ــــ" شاہ زین بھی غصے سے بڑبڑائے اور وہ مسکینی سے بولا۔

"چاچو! یہ انتظامیہ کا قصور نہیں۔ یہ تو ایک اوپن آفر ہے، جو بچے اضافی رقم جمع کرنا چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں وقت کا ضیاع۔"

"مگر شاہ میر! تم تو ان بچوں کے لیے رول ماڈل ہو ناں پھر تم سے یہ چوک کیوں ہوئی؟"

"میرا پڑھنے میں دل نہیں لگتا۔" ایک نپا تلا جواب آیا۔

"پھر کس چیز میں دل لگتا ہے؟" دادو جان نے تپ کر کہا۔

"مجھے سوشل ورک کا شوق ہے مجھ سے نہیں ہوتیں یہ پڑھائیاں۔ سوشل ورک کے لیے انسان کا حساس ہونا ضروری ہے اور وہ میں ہوں۔"

"سوشل ورک کوئی کام نہیں ہوتا آگے بیوی بچوں کو آگے چل کر کیا کھلاؤ گے سوشل ورک کی بدولت یا سوشل ورک کی شہرتیں؟" شاہ زمان چاچو کا غصہ دیدنی تھا اور شاہ سروز کو جیسے ایک دم سے کچھ یاد آیا تھا۔

"تم نے پیپرز میں چیٹنگ بھی کروائی تھی جس کی وجہ سے اس بار تمہارا ایگزامز میں بیٹھنا بھی ناممکن تھا۔ وہ تو پرنسپل صاحب نے مجھے فون کرلیا اور میں نے معاملہ رفع دفع کروادیا۔"

"چیٹنگ کیوں کروائی تھی؟" اس پہ سوال سامنے آیا اور شاہ میر کھڑے سے بیٹھ گئے۔

"اپنا جگر پیپر دے رہا تھا میں نے کہا کوئی پرابلم نہ ہو اسے اس لیے بوٹیاں بنوائیں اور لگ گیا کام سے۔ اس نے تو منہ نہیں لگایا مگر دوسرے اسٹوڈنٹس نے دلچسپی دکھائی تو میں نے وہ ساری بوٹیاں وہاں چلادیں لوگ ایک بوٹی کے سو روپے لے رہے تھے میں نے پچاس روپے میں دے کر پرافٹ کمالیا اب یہ کوئی بری بات ہے؟"

سب بڑے تو ہکا بکا ہوئے ہی تھے خود دائم بھی حیران رہ گیا تھا۔

"اتنے بزنس مائنڈڈ کب سے ہو گئے شاہ میر۔" کمرے میں خاموشی تھی۔ کسی کو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا تب شاہ زین چاچو نے کہا۔

"اچھا تو یہ بوٹی مافیا کا حصہ بننا کون سا سوشل ورک ہے۔"

شاہ میر نے شرارت سے دیکھا "دیکھیے! اتنی بڑی کتاب سے مختصر مواد نکلوانا، ٹکرو کروانا پھر جان پر کھیل کر اسے اوبجیکشن تک پہنچانا سوشل ورک پلس نیکی ہے۔"

"نیکی ــــ" دادو جان کی چیخ نکل گئی تھی۔

"کسی کی مدد کرنا نیکی ہی تو ہے بابا!" رسان سے کہا گیا، اور وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ شاہ میر وہیں بیٹھے رہے مگر دائم باہر نکلا تھا۔ شاہ سروز گلہ کر رہے تھے۔

"دیکھ رہے ہیں ماں بابا وہ کتنا بگڑ گیا ہے" اسے اچھے

بُرے، غلط صحیح کی تمیز بھی ختم ہو گئی ہے۔ باقی چھوٹے بچے اس سے کیا سیکھیں گے؟ نیلو فر ٹھیک کہتی ہے، دائم اس کے ساتھ رہا تو یہ بھی بگڑ جائے گا اور میں نے اپنے بیٹے کے حوالے سے بہت اچھے اچھے خواب دیکھے ہیں۔"

دادو جان سر جھکا کر رہ گئے۔ دوسرے دن وہ کالج گیا۔ کالج کا ایک لڑکا شاہ میر سے بہت زیادہ ریشہ خطمی ہو کر مل رہا تھا۔

"شکریہ شاہ میر! اگر آپ اس چیٹنگ اسکینڈل سے مجھے نہ بچاتے تو میری ماں تو یہ صدمہ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی، پتا نہیں کیا سوجھی تھی مجھے شارٹ کٹ مارنے کی۔"

شاہ میر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا پھر نرمی سے بولے "شکریہ تو مجھے تمہارا کہنا چاہیے اگر تم مجھے دائم کے نوٹس بنوانے میں ہیلپ نہ کرتے تو میرا جگرا ایسے پلس نہیں لا سکتا تھا۔"

"کمال شاہ میر! ساری محنت آپ نے کی تھی ہم نے تو صرف پوائنٹس بتائے تھے، ساری کتابیں کھنگالنا، سب کچھ لکھنا لکھوانا، یہ تو ساری آپ کی محنت ہے۔"

دائم کا دماغ ایک دم بھک سے اڑ گیا تھا "اگر آج وہ یہ سب کچھ نہ سنتا تو یہ ساری باتیں ہمیشہ راز رہتیں مگر ان باتوں پر کسی نے یقین نہیں کرنا تھا شاید وہ خود بھی نہ آتا، یعنی وہ بے چارے اس لیے اس سے دور رہتے تھے بعدیم الفرصت ہوتے یا تھکے ہوئے ہوتے تھے اور اس نے کیا کیا معنی دیے تھے اور وہ ٹکٹیں جمع کرنے کا قصہ یکدم اسے کچھ یاد آیا تھا اور وہ ان کی اس کام میں مدد کرنے والے دوست ظفر کے سر ہو گیا تھا۔

"بتائیے ناں ظفر بھائی! شاہ میر ٹکٹوں کے پیسے کہاں کھواتے ہیں۔"

"وہ بڑا ذہین ہے۔ اس کی کوئی بھی جسمانی یا ذہنی انگر سائز ہو تو یا وقت کا ضیاع نہیں ہوتی۔"

"پھر بولیے ناں کیا کرتے ہیں وہ روز ان پیسوں کا؟"

ظفر بھائی نے ادھر اُدھر دیکھا اور بولے "میرے پاس ایک منی باکس ہے شاہ میر روز کے پیسے وہاں جمع کرواتے ہیں پھر ایسے اسٹوڈنٹس وغیرہ کی مدد کرتے ہیں جنہیں پیسوں کی ضرورت ہو مگر اس کی جیب اجازت نہ دیتی ہو، وہ کم آمدنی والے گھرانے کے بچوں کو کتابیں اور دیگر چیزیں مہیا کرتے ہیں۔"

"بو تلیں جمع کرنے سے اتنی رقم جمع ہو جاتی ہے؟" اسے حیرت ہوئی۔

"نہیں شاہ میر اپنی پاکٹ منی کا ایک اچھا خاصا حصہ بھی ڈالتے ہیں پھر ہم سب دوستوں کا گروپ بھی اس میں حصہ ڈالتا ہے سو اب تک اچھا خاصا کام کر چکے ہیں۔ اس بار پرنسپل سے مل کر کالج میں ایک پیڑ کے سائے تلے اپنا کیبن بھی لگایا ہے۔ پچھلی کلاسوں سے پرانی کتابیں آدھی قیمت میں لے کر ضرورت مند اسٹوڈنٹس میں تقسیم کرتے ہیں، رجسٹر جرنلز سب کچھ۔"

"اچھا تب ہی پرنسپل صاحب نے بابا جان کی باتوں پر اتنی جلدی شاہ میر کو معاف کر دیا تھا ورنہ یہ پرنسپل صاحب بہت ایمان دار اور سخت گیر پرنسپل مشہور تھے۔"

"بابا خوش ہیں کہ یہ ان کی معذرت اور نام کا کمال ہے اور وہ خاموشی سے اپنا کمال دکھا کر ساری لعن طعن خود سہ کر الگ کھڑے تھے۔ نیکی کیا ہے اسے کس طرح کرنا چاہیے، یہ صرف شاہ میر جانتے تھے تب ہی تو ان کا داہنا ہاتھ سخاوت کرتا تھا اور بایاں ہاتھ لاعلم رہتا تھا۔ وہ جو ہر وقت ان کے ساتھ ہونے کا دعوے دار تھا اسے بھی کہاں پتا تھا۔

"میں ہمیشہ شاہ میر کو غلط جج کرتا ہوں۔" اس نے گہرا لمبا سانس کھینچا اور خاموشی سے گھر آ گیا۔ غیر متوقع طور پر شاہ میر اسے ڈریسنگ روم کے سامنے کھڑے نظر آئے ڈارک براؤن کرتا، سفید شلوار میں ان کا رنگ کھل رہا تھا۔

"کہیں جا رہے ہیں؟" ان کی بڑی بڑی آنکھوں نے اس کے خدوخال کو آشنائی سے چھوا مگر وہ کچھ

بولے نہیں تھے۔

"شاہ میر! ابھی تک خفا ہیں۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور یکدم ہراساں ہو گیا۔

"آپ کو اتنا تیز بخار ہے۔"

"آپ کہیں نہیں جا رہے ہیں۔ سنا آپ نے۔۔۔۔" اس نے کمرے کو لاک کر دیا تھا مگر وہ آہستگی سے کولہا پوری پہن رہے تھے۔

"اگر آپ نہیں رُکے تو میں دادی جان کو بلا لوں گا۔"

"جاؤ! اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو۔" یہ پہلا اور آخری جملہ تھا۔

"آپ مجھے تو لے جا سکتے ہیں ناں۔" وہ نئے سرے سے منت پر اتر آیا تھا۔

"عین موقع پر ساتھ چھوڑنے والوں اور اعتبار نہ کرنے والوں کو میں کہیں نہیں لے کر جاتا۔"

"آپ کو پتا ہے اگر آپ مجھے ٹینشن دیں گے تو پھر خود بھگتیں گے۔"

یہ اس کا آخری حربہ تھا جو وہ کبھی کبھی ضد پوری کروانے کے لیے اماں جان' بابا جان یا مہو کے سامنے آزماتا تھا بلکہ خود بخود ہو جایا کرتا تھا غصے اور ٹینشن سے اس کے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی تھی' بظاہر اس کی طبی کوئی وجہ نہیں تھی' ہزار بار کے ٹیسٹ یہی کہتے تھے مگر اس کے بچپن کا یہ مسئلہ آج تک برقرار تھا۔

شاہ میر کے سامنے ایسا کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پیش آئی تھی' وہ ہمیشہ ماموں کے گھر رہا تھا اور نیلوفر بھابھی اس کے متعلق کوئی اپ ڈیٹ کسی کو دینا مناسب نہیں سمجھتی تھیں۔ یہ ان کے بیٹے کی کمزوری تھی اور وہ گھر میں اس کمزوری کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔

"شاہ میر! آپ اگر اکیلے گئے یا اور تھوڑی دیر مزید مجھ سے ناراض رہے تو میں مر جاؤں گا۔" اس کا سانس تیز ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ شاہ میر نے دروازے سے مڑ کے اسے دیکھا وہ بیڈ پر بیٹھے سے یکدم گر گیا تھا اس کے سانس لینے کی آواز بہت تیز تھی' کیسا غصہ کہاں کا غصہ' شاہ میر یکدم بھاگ کر اس کے پاس دوڑے آئے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے پاگل! ابھی تو اچھا بھلا تھا۔" انہوں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا تھا۔ اس نے شاہ میر کے کندھے پر سر رکھ دیا تھا۔

"آپ ابھی تک خفا ہیں مجھ سے۔۔۔۔" اس سے جملے بھی ادا نہیں ہو رہے تھے۔ اس نے ان کے کندھے پر آنکھیں رگڑی تھیں اور شاہ میر ہونق رہ گئے۔

"بھاڑ میں گئی ناراضی' یہ ہوا کیا ہے؟ بچپن میں اماں جان سے سنا تھا' ضد میں لمبی سانس کھینچ لیتا ہے' نیلا پیلا ہو جاتا ہے مگر اب تو اتنا بڑا ہو گیا ہے تیری یہ عادت ابھی تک نہیں گئی۔"

"ہاں زیادہ اپ ڈیٹ ہو گئی ہے۔" وہ پھیکا سا ہنسا شاہ میر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر درود پڑھنے لگے۔ اس کی دھڑکنیں آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگی تھیں۔

پندرہ منٹ بعد وہ بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔

"کوئی ٹیبلٹ لیتے رہے ہو ایسے موقعوں پر؟"

وہ سر ہلا کر ٹیبلٹ نکال کر دکھانے لگا تھا۔

"یہ تو اعصاب کو ریلیکس کرنے کی ٹیبلٹ ہے بہت مائنر M.G کی ہے۔ ڈونٹ وری آئندہ صرف درود سے کام چلانا۔" انہوں نے اسے خود سے لپٹا لیا اور وہ بے ساختہ بولا۔

"آئی لو یو شاہ میر! آپ کی جگہ کوئی کبھی بھی نہیں لے سکتا۔"

"مجھے پتا ہے' اسی لیے تو نخرے دکھا رہا تھا۔" وہ ہنسے اور تھوڑی دیر بعد ہمیشہ کی طرح دونوں ساتھ ہی نکلے تھے۔

"یہ دائم ہر وقت ان کا دم چھلا کیوں بنا پھرتا ہے؟"

"اس لیے بھابھی کہ وہ دونوں چاند اور ہالہ کی طرح ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہی سجتے ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے الگ کریں گی تو دوسرا بے رنگ' بے ذائقہ ہو جائے گا۔"

نیلوفر بھابھی نے مڑ کر عائشہ کی طرف دیکھا مگر کچھ

کیے بغیر آگے بڑھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

دائم ایک نچلے متوسط طبقے کی کلاس شادی میں شریک تھا اور اسے ایک بار پھر شرمندگی ہو رہی تھی اس نے شاہ میر کو کتنا غلط سمجھا تھا لڑکی کی شادی تھی اور شاہ میر اسے رش میں چھوڑ کر کہیں باہر گم ہو گئے تھے۔ بوڑھی عورتیں اس کا شکریہ ادا کر رہی تھیں اور وہ شمل خان کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"آپ کا بھائی بہت کمال کا آدمی ہے۔ اس نے مجھ جیسے شخص کو سدھارا ہے' یہ صرف وہی کر سکتا تھا۔ میں بہت برا انسان تھا۔ گھر کے حالات کی وجہ سے اتنا گرا ہوا کام کرتا تھا' پھر ایک دن تمہارا بھائی ملا ہم اسے بھی عام گاہک سمجھا' وہ روز ہمیں ملتا ہمیں حالات سے لڑنے کے' قسمت بدلنے کے نئے نئے راستے بتاتا مگر ہر راستہ مشکل' ہر راستہ کٹھن لگتا۔ جب حرام منہ کو لگ جائے تو محنت کرنے کو جی نہیں کرتا۔ ہمارا بھی یہی حال تھا ہم قسمت کو اپنی ذمہ داریوں کو اپنے برے ہونے کی وجہ سمجھ کر مطمئن رہتا' وہ ہمیں ایسے لوگوں کے قصے سناتا' جو ہم سے بھی گئی گزری زندگی گزارتے تھے مگر حرام نہیں کھاتے تھے ہم اس کی باتوں سے چڑ جاتا' اس سے لڑ پڑتا مگر وہ بڑا ڈھیٹ لوگ تھا ہم کو برداشت کرتا۔ وہ اکثر اپنی ٹیبل پر ہماری سروس کی مانگ رکھتا ہمیں اچھی خاصی ٹپ دیتا' منیجر تمہارے بھائی کے نام کی وجہ سے چپ رہتا تھا ورنہ ہوٹل کے کمروں کا سروس عملہ اور ڈائننگ ہال کا سروس عملہ الگ الگ ہوتا ہے مگر وہ ہمیں ہی اپنی ٹیبل پہ حاضر دیکھتا۔"

دائم کرسی پر بیٹھ گیا اور شمل خان نے پھر سے کہا تھا

"اس دن بھی وہ ایسے ہی ڈائننگ ہال سے اٹھ کر ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ اس وقت ہم روم نمبر 7 کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک عبایا میں ڈھکی چھپی لڑکی آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"گل۔" اس کا لہجہ خاص فرنٹیئر کا تھا ہمارا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

"تم یہاں کیسے آیا؟" ہم اس پر چیخا تھا تب ہی روم نمبر 7 کا آدمی ہمارے سامنے آ گیا۔ اس نے گل کو دیکھ کر سیٹی بجائی۔

"ہم کو یہی چاہیے۔" اور اس کا یہ جملہ سن کر ہماری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

ہم اس آدمی سے لڑ پڑے۔ ہم نے اس کا مار مار کر بھرکس نکال دیا' پھر ہم گل کی طرف مڑے تو اس نے نقاب اتار دیا ہم نے ٹھنڈی سانس لی ہم نے اس وقت سوچا ہماری معصوم گل اس شہر کے راستے کہاں جانتی ہے جو اتنے بڑے ہوٹل میں آ گئی۔ وہ کوئی اور لڑکی تھی اور جب ہم پھر سے سنبھل رہا تھا' تمہارا بھائی یکدم سے سامنے آ گیا اور نرمی سے بولا۔

"یہاں واقعی گل بھی ہو سکتی تھی کیونکہ ہم بڑی چھپ کر کتنے پردوں میں کریں' بھی نہ بھی وہ ہمارے گھر کا راستہ ضرور دیکھتی ہے ہمارے گھر کے اندر داخل ہو کر ہم پر ہنستی ہے اور کہتی ہے اب تم جاؤ اگر کر سکتے ہو' کیوں بھول گئے اللہ کی بے آواز لاٹھی کو' اللہ کے مکافات عمل کو۔"

"ہم نے سنا اور ہم دیوار سے لگ گیا۔ پہلی بار زندگی نے بری طرح ذلیل کیا تھا آئینہ دکھایا تھا ہم نے سوچا اگر واقعی یہاں کسی دن گل کھڑی ہو اور اسے استعمال کرنے والا کوئی اور کمینہ آدمی ہو تب تمہارے بھائی نے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک بات کی تھی۔

"تم یہ کیوں نہیں سوچتے' ہر لڑکی گل ہی ہوتی ہے' گل ہی ہوتی ہے' معصوم مجبور بے چاری سی۔ تم تو اس علاقے سے تعلق رکھتے ہو' جہاں کے لوگ عورتوں کی عزت کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں اور علاقے' قوم کی تخصیص نہیں کرتے' سب عورتیں چاہے ان کا تعلق کہیں سے ہو' تمہارے لیے قابل احترام ہیں اور یہی تمہاری اس بی داری کا غرور رہا کرتا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے' ہماری پشت پر ہمارے پٹھان

بھائی ہمیں کبھی غیر کے سامنے جھکنے اور ذلیل نہیں ہونے دیں گے۔"

ہم اس دن بہت رویا تھا پھوٹ پھوٹ کر۔ ہم نے مرنے کی کوشش بھی کی مگر تمہارے بھائی نے ہمیں بانہوں میں لے کر روک لیا تھا پھر کہا حرام موت ایک پکا مسلمان نہیں مرا کرتا توبہ کا در ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔ موت سے پہلے توبہ کرلی جائے تو وہ رب کائنات کبھی مایوس نہیں لوٹاتا۔

ہوٹل میں ہنگامے اور ہوٹل کے مہمان کی پٹائی پر ہم پریشان تھے کہ تمہارا بھائی یہاں بھی ہمارا ڈھال بن گیا اس نے اس مہمان کو ایک ویڈیو فلم دکھائی پھر سخت درشت لہجے میں بولا تھا "اگر تم نے اس معاملے کی اطلاع انتظامیہ کو دی تو یہ ویڈیو فلم تمہاری بیوی کو بھیج دی جائے گی۔ میں نے سنا ہے وہ غصے میں قتل بھی کر دیا کرتی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے یہ سارے عیش و آرام اور عیاشی اسی کی دولت کے مرہون منت ہے۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے تم یہ عیش برقرار رکھنا چاہتے ہو یا گنوانا۔"

تمہارے بھائی نے اتنے آرام سے ہمارا کیس حل کیا کہ ہماری نوکری بھی نہیں گئی اور آج ہم اپنی گل کی شادی کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یہ سارا انتظام اور جہیز سب تمہارے بھائی کے ٹرسٹ نے دیا ہے۔ تم بہت خوش نصیب کہ اتنے فرشتے انسان کے ساتھ رہتے ہو ایسا لوگ ہی تو دھرتی کا حسن ہیں ان کی زندگی دشوار اور مخالفت سے بھری ہوئی ہے مگر ان کے دامن دعاؤں اور محبتوں سے خالی نہیں ہوتے۔"

دائم بسروز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ شاہ میر کو ڈھونڈتا ہوا باہر آیا۔ وہ باہر مردوں کے ساتھ روایتی رقص میں مصروف تھے۔ مگن خوش مطمئن۔

"واؤ سرجری؟" اس طلسم بھری اطلاع نے اسے پوری طرح خوش فہمیں ہونے دیا اور اس کے دل کو پھر سے مٹھی میں لے لیا تھا۔

"یہ تو بہت کمال تو ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک نئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"آپ کون؟" اس نے سوالیہ دیکھا۔ سامنے بیٹھا شخص مسکرانے لگا۔

"کسی زمانے میں مجھے گمان تھا کہ میں بہت اعلا پائے کا جیب کترا ہوں میں نے ایک بار اس شخص کی جیب صاف کی تھی۔ بہت بڑی رقم ہاتھ لگی تھی پندرہ دن آسانی سے کٹ گئے تھے پھر پندرہ دن بعد یہ وہیں کھڑا تھا۔ میں نے رش میں پھر اس کی جیب کاٹ لی۔ رقم اس بار بھی بڑی نہیں تھی پھر یہ معمول ہو گیا' مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کیا شخص ہے اس کی ہر ماہ جیب کٹتی ہے مگر یہ شور واویلا نہیں کرتا آج کے دور میں تو امیر سے امیر آدمی بھی "پورا نہیں پڑتا" کی دہائیاں دیتا ہے۔ یہ کون سی فیری لینڈ کا قصہ ہے۔ جو یہاں اس دنیا میں آ دھرا ہے' یہ افسانوں سی بات سہی مگر میں واقعی اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"سر! میں رفیق۔۔۔۔"

وہ ایک پٹھان کے ہوٹل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس نے مجھے مسکرا کے دیکھا اور کہا۔

"اچھا ہوا رفیق صاحب! آپ آگئے۔ پلیز میری چائے کا بل پے کر دیجیے کیونکہ آج غلطی سے میں ہپ پاکٹ کا والٹ لانا بھول گیا۔"

میرا تو وہ حال تھا کہ سر اٹھاؤں تو کیسے اس شخص نے میرا گند دھا تھا۔

"ہو جاتا ہے رفیق صاحب! جب انسان مجبور ہو' اس پر ذمہ داریاں ہوں' وہ پڑھا لکھا بھی ہو مگر پھر بھی اچھی نوکری نہ ملے تو انسان ایسے شارٹ کٹ مار ہی لیتا ہے پہلے میں بھی ایسے ہی کام کرتا تھا مگر پھر ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے جس بوڑھے آدمی کا والٹ نکالا اس کے والٹ میں چند سو کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ اس کی بیوی کینسر کی مریضہ تھی اور وہ اس کے لیے ریڈ سیل کی بوتل لینے نکلا تھا۔ اس نے اس خط میں اپنے بیٹے کو گھر کے حالات سنائے تھے۔ اس کے دو بیٹے تھے اور دونوں ملک سے باہر سیٹل اور وہ اتنا خوددار تھا کہ اس نے وہ خط لکھ تو لیا تھا۔ مگر پوسٹ نہیں کر پایا مجھے وہ چند سو نہیں سمندر جتنے آنسو لگے' جو اس کی بے چارگی

اور کم مائیگی نے بہائے تھے۔ میں نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا اور اس کے گھر پہنچا وہ بوڑھا آدمی اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں اداس بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں والٹ دیا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

"شکریہ بیٹا! اگر تم نہ آتے تو میری تو شناخت ہی گم ہو گئی تھی۔ میں کسی کو کیسے بتاتا میرا کیا نام ہے میں کون ہوں کیا میں واقعی اس ملک کا شہری ہوں۔"

وہ چپ ہو گئے تب میں نے سوچا تھا یہ شخص نفسیات کی مار، مار رہا تھا۔

"کیا میں واقعی اس ملک کا شہری ہوں۔" یہ ایک جملہ مجھ میں اٹک گیا۔ میں رونے لگا تھا۔ اس شخص نے میرے ہاتھ میں ایک کارڈ پکڑا دیا۔

"یہاں کل چلے جایئے گا۔ میرا ایک دوست ہے اس کو سیلز ورکر کی اشد ضرورت ہے۔ سیلری آپ کے کمائیوں سے کم ہو گی مگر عزت کی ٹمن بھرم کی اللہ کے حکم سے میں گارنٹی دیتا ہوں۔"

میں اٹھا اور اپنی جیب میں سے ان کا والٹ نکالنے لگا مگر وہ والٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔

"مجھے لگا اب آپ کو ان پیسوں کی ضرورت نہیں، اس لیے اپنا والٹ نکال لیا۔"

"آپ اتنے ماہر ہیں تو آپ....."

تمہارا بھائی زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا میں باہر نکلا اور ایک ٹھیلے والے نے بتایا "وہ جو بلیک گاڑی کھڑی ہے ناں اسی شخص کی ہے۔ بہت بڑا آدمی ہے جس من موجی سا ہے امیر غریب کا فرق نہیں کرتا۔"

میں نے سر ہلایا اور اسی راستے پر چل پڑا جس کا راستہ تمہارے بھائی نے بتایا تھا۔ بہت قدر کرتا اس کی۔ ایسے لوگ بہت کم دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔"

اس نے دیکھا، وہ ان سب باتوں سے بے پروا ابھی تک آگ کے شعلوں کے گرد رقص کر رہے تھے۔

"ان کی نفسیات یہ ہے اسے دنیا داری سے کوئی مطلب نہیں۔ یہ جبران کے خیالات کا آدمی ہے۔ یہ بڑی بڑی باتیں نہیں کرتا لمبی لمبی پریس کانفرنسیں نہیں کرتا، چھوٹے چھوٹے عملی قدم اٹھاتا ہے، یہ جانتا ہے سخاوت کرنا کیا ہوتا ہے، یہ جانتا ہے اگر آج ہم ہاتھ بھر بھر کے دیں گے تو ہمارا دنیاوی صندوق بھلے خالی رہ جائے مگر ہماری ہیشگی کی جگہ۔ سرسبز پھولوں کی کیاریاں بنیں گی ہماری قبر پر آسمان شبنم افشانی کرے گا اور ہم بہت سارے دلوں میں زندہ رہ جائیں گے زندگی کے بہت سارے قصوں میں آج کے سنے گئے اور ان سے ملتے جلتے بہت سارے قصوں میں امید کی طرح۔"

"شاہ میر! بہت دیر نہیں ہو گئی ہمیں۔" اس نے رقص کرتے شاہ میر کا ندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ رک گئے۔ ان کے گندمی رنگت میں سارے جسم کا خون انگارے مار رہا تھا۔ بخار اور یہ رقص۔ دائم کو لگا ان کا ٹمپریچر اور بڑھ گیا ہے۔

"آپ کا بخار بہت تیز ہو گیا ہے۔" وہ فکر مند ہوا مگر انہیں پروا کب تھی۔ وہ شمل خان سے گلے مل رہے تھے رفیق سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

"آج کی تقریب میں مجھے یاد رکھ کر آپ نے میری عزت بڑھا دی شاہ میر صاحب!"

رفیق نے تشکرانہ دیکھا اور وہ ہنس پڑے ہمیشہ کی طرح پھر مسکرا کے بولے۔

"بہنیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں رفیق صاحب!"

"آپ نے اپنی مصروفیت میں سے وقت نکالا، یہ واقعی بڑی بات ہے، ورنہ آج کل تو لوگوں کے پاس اپنے لیے بھی وقت نہیں ہے۔"

رفیق مسکرانے لگا اور وہ گاڑی میں آن بیٹھے۔ دائم کا دل چاہا وہ ہسپتال والی بات کا بھی پوچھے مگر موقع نہیں ملا۔ وہ گھر میں داخل ہوئے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہے ہیں برخوردار؟"

"بابا جان! ایک دوست کی بہن کی شادی تھی۔"

"شام سے گئے ہوئے ہو اور اب آ رہے ہو۔" نیلوفر بھابھی جل بلا کر بولیں۔

اور شاہ میر نرمی سے بولے "شادی کے انتظامات بھی تو دیکھنے تھے بابا جان! اس لیے دیر ہو گئی۔"

"تم دائم کو بگاڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے

نہیں دینا چاہتے۔" یہ حیا بھابھی تھیں۔

"بھلا دیر سے گھر آنے کا مطلب ہمیشہ بگڑ جانا ہی کب ہوتا ہے، ہو۔"

"بابا جان! اسے آپ کی اور اماں جان کی شہہ ہے، جو یہ کسی کے اختیار میں نہیں آتا۔"

شاہ میر خود کو کمزور محسوس کر رہے تھے، انہیں برا لگتا تھا اگر ان کی وجہ سے ان کے اماں جان یا بابا کو سننا پڑتا۔ وہ اس صورت حال سے بچنے کے لیے کوئی معرکتہ الآرا اقتباس سوچ ہی رہے تھے کہ بابا جان نے انہیں یکدم سینے سے لگالیا۔

"میں سمجھتا تھا میں نے سب کچھ گنوا دیا۔ شہری زندگی نے مجھ سے میری مٹی کی خوشبو رشتے ناتے سب چھین لیے، مگر آج جب بھائی جی کی طرف گیا تو پورے گاؤں نے کسی وی وی آئی پی کی طرح ٹریٹ کیا۔ ہر شخص شناسا، ہر شخص اپنا ان کے ملا، سب ان ذمہ داریوں کو احسن طور پر نبھانے پر میرا شکریہ ادا کر رہے تھے جو میں نے شہری زندگی جینے کے باوجود ادھوری اور لاتعلقی کی نذر نہیں کی تھیں۔

آج بھائی جی کا فون آیا تھا، وہ شہر آ رہے تھے۔ یہاں کے ایک بڑے ہسپتال میں ان کے دل کی والو سرجری تھی، میں اس لیے بھاگا گیا، شاہ میر! واقعی جب رشتے آپ کے ارد گرد ہوں تو آپ کو لگتا ہی نہیں ہے، یہ سرکل کوئی توڑ سکتا ہے یا یہ سرکل ٹوٹ سکتا ہے، مگر یہ بیماریاں دکھ، یہ انسان کے اندر الارم بجا دیتے ہیں۔ میں بھی پہلی بار ڈر گیا بھائی جی کو خود شہر لایا ہوں اور اس وقت تمہارے سامنے کھڑا تمہارا اتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔

تم نے جس طرح سے میری ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لیں، انہیں نبھاتے رہے، ان سب کے دلوں میں مجھے زندہ رکھا، وہ صرف تم ہی کر سکتے تھے، بزنس ہر کوئی کر سکتا ہے۔ زندگی بھی بہت بجلی، ہر کوئی جی سکتا ہے، مگر دوسروں میں رشتوں کی ذمہ داری نبھا دینا، ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ تم واقعی زندگی کی خوب صورتی ہو۔"

شاہ میر حیران اور وائم خوش ہو رہا تھا جیسے یہ ساری تعریفیں اسی کی ہو رہی ہوں۔

"پتا ہے پورے بتیس دانت ہیں، اب اسے اندر بھی کر لو۔"

وہ کان کے قریب گنگنائے۔ وہ جھینپ گیا۔ نیلوفر بھابھی بڑبڑانے لگیں۔ شاہ سروز مسکرانے لگے اور بابا نے اچانک پوچھا۔

"تمہیں بخار ہو رہا ہے شاہ میر!"

"نہیں تو بابا! ابھی پر روٹیاں لگا کر آ رہا ہوں اس لیے گرم ہو رہا ہوں۔" وائم پھر ہنسنے لگا اور بابا نے شاہ میر کا کان پکڑ لیا۔

"نالائق! اپنے بابا پر پوائنٹ مارتا ہے۔" شاہ میر کچھ نہیں بولے اور وائم نے سوچا "کاش وہ شاہ میر کی بیس فیصد ہی کاپی کر سکتا تو دنیا اور آخرت دونوں سدھر جاتیں مگر اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا بھی تو کم کمال نہیں۔ اچھے لوگوں کو آج کل کون پسند کرتا ہے؟ کوئی نہیں۔ اور وہ یہ کمال رکھتا تھا۔ اس لیے خوش تھا بہت سی دعائیں اس کا بھی احاطہ کر رہی تھیں، دعائیں جو قسمت، حال، مستقبل سب کچھ بدل دیتی ہیں۔

اور وہ سر سے پیر تک بدلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ باقی گھر والوں کی طرح کفران نعمت نہیں کرنا چاہتا تھا اور یہی صحیح فیصلہ تھا زندگی کا۔